اقبال کا شعورِ مزاح

کامل القادری

میزانِ ادب

اقبال کا شعورِ مزاح

اقبال کا شعورِ مزاح

کامل القادری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

طبع اوّل اکتوبر ۱۹۷۷ء

تعداد ۲۰۰۰

سال اشاعت ..... ۱۵ر نومبر ۱۹۷۷ء

تعدادِ اشاعت ۲۰۰۰

بہ اہتمام ..... اکرم زیبائی، میزانِ ادب

خوش نویس ..... ابو محمد الحسینی المدنی

مطبع ..... مشہور آفسٹ پریس

جلدسازی ..... مکتبۂ رشیدیہ

قیمت: ۱۵ روپے

میزانِ ادب

۲۰ بہادر شاہ مارکیٹ ایم اے جناح روڈ کراچی

عبداللہ عباس الندوی و حسن عسکری طارق کے نام

ترتیب

پہلا باب : موضوعِ مطالعہ

دوسرا باب : ذوقِ لطیفہ

تیسرا باب : خطوط بولتے ہیں

چوتھا باب : رنگِ اکبر کی حقیقت

پانچواں باب : طنزیہ اسلوبِ تنقید کا ارتقا

چھٹا باب : ضربتِ کاری کے مقامات

ساتواں باب : بندۂ گستاخ

آٹھواں باب : علامہ اقبال کا اسلوب

ضمیمے

۱۔ میر کی واسوخت اور اقبال کا شکوہ

۲۔ اقبال کی ایک نادر تحریر

۳۔ دو مصاحبے

(الف) پروفیسر احمد علی

(ب) ڈاکٹر جمیل جالبی

۴۔ ایپی گرامیٹک اسٹائل آف اقبال

علامہ اقبال بلبل ہند سروجنی نائیڈو اور احباب کے ساتھ پک نک منا رہے ہیں۔

۱۹۰۷ء نوجوانی کی ایک تصویر

۱۹۰۸ء لندن میں

۱۹۰۷ء علامہ اقبال ہیڈلبرگ میں اپنے قیام گاہ
کی مالکہ اور دوسرے قیام پذیروں کے ساتھ

۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری کے بعد

۱۹۰۷ء نوجوانی کی ایک تصویر

۱۸۹۹ء میں ایم اے کے بعد

علامہ اقبال (۱۹۳۱ء) پیرس میں۔

۱۹۱۴ء کی ایک تصویر

علامہ اقبال (۱۹۲۹ء) میں ننھے جاوید کے ساتھ ۔

۱۹۳۷ء کی تصویر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ میں شرکت کے موقع پر لی گئی۔

علامہ اقبال قرطبہ کی مسجد میں نماز ادا کر رہے ہیں

پہلا باب

موضوعِ مطالعہ

علامہ اقبال طبعاً بذلہ سنج تھے۔ شوخیٔ طبع چھپائے نہیں چھپتی۔ سوانح، مجلسی زندگی، خطوط اور کلام میں دلفریب طنز و مزاح کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لطیفہ گوئی، حاضر جوابی، فقرہ بازی اور طنز کرنے کا انہیں سلیقہ آتا تھا۔ اُن میں ہجو کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم تھی اور پھبتی اڑانے اور چبھتا ہوا مذاق کرنے کی قوت بھی۔ داغ کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ اصلاحِ سخن کے لیے داغ کا انتخاب ہی اِن کے فطری رجحان کی بھرپور غمازی کرتا ہے، ہرچند انہوں نے داغ کے رنگِ سخن کو ترک کرتے ہوئے جولانیٔ طبع کے لیے ایک وسیع و کشادہ تر میدان کا انتخاب کیا، لیکن یہ ترک و گریز افکار کی حدود سے تجاوز نہ کر سکا۔ طرزِ ادا اور اسلوب کے ارتقاء کی صورت میں رونما ہوا۔ داغ کی بہت سی لسانی خصوصیتیں اقبال کے اسلوب کی تشکیل میں معاون رہیں۔ خصوصاً داغ کا کاٹ دار لب و لہجہ، شوخی، چٹکی، چھیڑ، اٹھکھیلیاں اور طنز کرنے کا سلیقہ اقبال کے فکری سفر میں زادِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سے عہدِ حاضر کے خلاف جہاد میں علامہ اقبال نے نفاست سے کام لیا ہے۔

علامہ اقبال کا سوادِ قلم۔

اقبال کے فطری رجحان کا اندازہ اِس بیّن حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال نے اکبر کے رنگ میں کچھ چیزیں کہی ہیں۔ بڑے فنکار کی پیروی بھی بڑائی کی بات ہے۔ علامہ اقبال کی نظر میں اکبر الٰہ آبادی کا مرتبہ بڑا تھا۔ وہ پیر مشرق تھے[۱] علامہ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں، جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں"[۲]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں، اگر کوئی شخص میری مذمت کرے، جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں، بلکہ خوشی ہے"[۳]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی، اس وقت بھی ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی، جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی رہے گی"[۴]

اکبر الٰہ آبادی سے علامہ اقبال کی یہ عقیدت و ارادت بھی اُن کی شخصیت و فطرت کے ظریفانہ پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ علامہ اقبال نے اکبر کی پیروی میں بہت سی خوبصورت نظمیں

---

[۱] اقبال نامہ حصہ دوم خط بنام میاں ہاشم — مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۱۱ء [۲] اقبال نامہ حصہ دوم خط بنام لسان العصر اکبر الٰہ آبادی مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء ص: ۳۵-۳۴ [۳] ایضاً مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۱۱ء
[۴] ایضاً ۲۶ر جولائی ۱۹۱۴ء

GHALIB ACADEMY
(Hd. NIZAMUDDIN)

کہی ہیں ۔ اور شاید خود اکبر ٹوک نہ دیتے تو وہ اس زعفران زار جادے پر دور تک نکل جاتے۔ اس باب میں اقبال کا معذرت نامہ ملاحظہ فرمایئے:

"عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کی داد دینا مقصود ہو، اُس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کرکے اُس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔

میں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان و بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے [۵۲]

علامہ اقبال کی اس وضاحت کے بعد یہ کہنا بدمذاقی ہوگی کہ اقبال کی اگر طبیعت طنز و مزاح کے لطیف جوہر سے آشنا نہ ہوتی تو وہ اکبر کے رنگ کی اتنی کامیاب پیروی نہ کر سکتے۔ عبدالسلام ندوی نے اس حقیقت کی جانب یوں اشارہ کیا ہے:

"اکبر الہ آبادی کی تقلید میں ڈاکٹر صاحب نے چند ظریفانہ اشعار بھی لکھے ہیں، اور بعض موقعوں پر کامیاب بھی ہوئے ہیں ..... بہ اینہمہ وہ اس صنف میں مقلد ہیں، مجتہد نہیں" [۵۳]

لیکن میری نظر میں علامہ اقبال ظرافت کے میدان میں منفرد بھی ہیں اور مجتہد بھی۔ وہ تربیت یافتہ شعورِ مزاح کے حامل تھے۔ طنز و مزاح کا ملکہ مبدار فیض سے اُنھیں ودیعت ہوا تھا۔ وہ

---

[۵۲] مشمولہ "بانگ درا" [۵۳] اقبال نامہ، حصہ دوم، خط بنام لسان العصر اکبر الہ آبادی مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۱۲ء [۵۳] "مرد کامل" مصنفہ عبدالسلام ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء ص ۵۸-۱۵۶ [۵۴] میں یہ ترکیب وسیع تر معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ اس میں جملہ اوضاع و اقسام کے طنز و مزاح اور ظرافت و بذلہ سنجی کو شامل سمجھتا ہوں۔ بعض اجلاب طنز و مزاح کو دو مختلف جنس سمجھتے ہیں لیکن میں طنز کو مزاح کا جلالی روپ سمجھتا ہوں۔ دیگر اقسام مزاح، پھبتی، جملہ بازی، ضلع جگت وغیرہ میں کیفیت و کمیت کا فرق ہوتا ہے۔ مقاصد و وظائف کا بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن بحیثیت نوع یہ سب ایک ہیں۔

بُت طنّاز تھے۔ عبدالسلام ندوی کا یہ اعتراف بڑا وقیع ہے :

"ظرافت اگرچہ ان کی طبعی چیز تھی، لیکن اس میں بھدّا پن اور چھچھورا پن نہیں پایا جاتا تھا" [۱]

علامہ اقبال کی ابھی تک کوئی مستند سوانح حیات نہیں لکھی گئی ہے۔ جو سوانحی حالات منظرِ عام پر آچکے ہیں، اُن کی تنقیح بھی نہ ہو سکی ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال سے منسوب مجلسی لطائف و مطائبات سے کسی نتیجے کا استنباط کرنا مناسب نہیں۔ البتہ عطیہ بیگم فیضی کے مشاہدات کو پیش کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ان سے اقبال کی فطرت کا ظریفانہ رنگ جھلکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں ؎

"۲۲ر اپریل ۱۹۰۷ء کو سابقہ انتظام کے مطابق میں، اقبال اور شیخ عبدالقادر کی معیت میں کیمبرج کے لئے روانہ ہوئی۔ تمام راستے یہ دونوں اسکالر بڑے عالمانہ انداز میں گل افشانیاں کرتے رہے، جس میں ظرافت و مزاح کی چاشنی ملتی تھی" [۲]

آگے چل کر ایک پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی فطری بزلہ سنجی کا نقشہ یوں کھینچتی ہیں :

"اقبال نے چست و چاق، پُر مذاق، فی البدیہہ شعروں سے، ہر اہم مہمان کا ذکر اس کے خصائص سے متعلق مبالغہ آمیز نکتہ آفرینی کر کے کیا۔ مارے قہقہوں کے ہمارا بُرا حال تھا" [۳]

ایک اور جگہ وہ لکھتی ہیں ؎

"عام گفتگو میں وہ بذلہ سنج تھا، اگرچہ اس کے مزاج میں کلبیت کی ایک لَے شامل تھی" [۴]

آخری جملہ معنی خیز ہے۔ علامہ اقبال کو خوش طبعی گدگداتی تھی، ذکاوت نوبہ نوبہ فقرہ تخلیق کرتی تھی جس میں وقار، سنجیدگی اور مزاح کا ملا جلا رنگ ہوتا تھا۔ لیکن وہ ہنستے ہنستے کبھی محوِ یاس بھی ہو جاتے تھے۔ یہ الم انگیز کیفیت بارِ نشاط کا نتیجہ تھی یا کچھ اور۔ اس حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے

---

[۱] "مرد کامل" ص ۵۶ نیز ۹۰ تا ۹۳ [۲] اقبال ۔ عطیہ بیگم فیضی مترجمہ عبدالعزیز خالد ص ۲۰ [۳] ایضاً ص ۲۳ [۴] ایضاً ص ۲۷

اُن کی طفلی اور عنفوانِ شباب کے حالات کی تحقیق ضروری ہے۔ تاکہ جس ادائے خاص کو عطیہ بیگم فیضی نے اقبال کے مزاج کی کلبیت سے تعبیر کیا ہے، اُس کی حقیقت کھل سکے۔

اقبال کے طنز و مزاح کا حدف لوگوں کی کمزوریاں بھی ہوا کرتی تھیں، اُن کے لیے فقرے بے ساختہ ہوتے تھے۔ گویا تیز نگاہ نقاد کا مشاہدہ ذکاوت کے چقماق سے مَس ہو کر چُبھتے فقرے میں ڈھل جایا کرتا تھا۔ عطیہ بیگم فیضی کے مشاہدات ملاحظہ فرمائیے:

"کھانے کے میز پر میں نے اقبال کو فارسی، عربی، سنسکرت کا شناور حاضر جواب، دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کو ہمہ وقت تیار اور حاضرین میں کٹیلے فقرے کسنے میں تیز طرار[1] پایا

اقبال کی ایک اور خصوصیت کی جانب عطیہ بیگم فیضی یوں اشارہ کرتی ہیں ؎

"اقبال کو حسب دلخواہ اپنے آپ کو خوشگوار اور عزیزِ خاطر بنانے کا ملکہ حاصل تھا۔ انجمن میں وہ انجمن آرا تھا، حاضر جوابی یا نکتہ گستری میں کبھی پیچھے نہ رہا" [2]

اقبال کی فطری ظرافت لطیفہ گوئی، فقرہ بازی اور حاضر جوابی تک محدود نہ تھی، وہ شعر کا ملبوس زعفرانی بھی اختیار کر لیا کرتی تھی، ہر چند ایسی فی البدیہہ نظموں، شعروں کو علامہ اقبال وقتی چیز سمجھتے تھے اور انھیں خود محفوظ نہ رکھا اور دوسروں نے محفوظ کرنا چاہا تو منع کر دیا۔ عطیہ بیگم کے اعترافات ملاحظہ فرمائیے:

"بزم بہت گرما گرم تھی، اقبال نے ایک مزاحیہ نظم کہی تو ان خواتین (مس سلوسٹر اور مس لیوی) نے اسی طریقے سے بیتوں میں جواب دیا فضا شروع سے آخر تک علمی آتش بازی سے گونجتی رہی۔ ایک وقت میں نے اقبال کے مصرعوں کو لکھنے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا:

---

[1] اقبال ـــــ عطیہ بیگم فیضی ص ۱۰، [2] ایضاً ص ۱۸

یہ باتیں صرف اسی خاص موقع کے لیے ہیں، اور ادائیگی کے ساتھ ہی
ان کا کام ختم ہوگیا [1]

بہر کیف مندرجہ بالا بیانات سے اُن میں ظریفانہ طبیعت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سبکِ اکبر کی پیروی کا زمانہ تو "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے بعد آتا ہے۔ اور پیروی میں بھی اقبال کا مجتہدانہ رنگ نمایاں ہے۔

اقبال کی حاضر جوابی حشر ساماں تھی۔ عطیہ بیگم فیضی کے مشاہدات کا ریکارڈ ملاحظہ فرمائیے۔

"۲۹ر جون ۱۹۰۷ء کی ایک دعوت میں مس سروجنی داس بھاگم بھاگ اندر داخل ہوئی اور ہر شخص کو جو اس کے راستے میں آیا نظر انداز کرتے ہوئے فرطِ جذبات سے بے دم، اُس نے اقبال کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "میں صرف تم سے ملنے کے لئے آئی ہوں"

اقبال نے یہ ستائش یہ کہہ کر لوٹا دی "یہ صدمہ اتنا ناگہانی ہے کہ اگر میں اس کمرہ سے زندہ باہر نکل سکوں تو مجھے حیرت ہوگی" [2]

اقبال کی حاضر جوابی کا یہ ایک نمونہ ہے۔ جن لوگوں نے سروجنی نائیڈو کی صورت و شکل دیکھی ہے وہ اس طنز کی معنوی گہرائی کا بخوبی احساس کر سکتے ہیں۔

علامہ اقبال عملی مذاق کرنے میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اِس سنجیدگی اور وقار کے ساتھ مذاق کرتے کہ یہ فیصلہ کرنا محال ہوتا کہ کیا واقعی وہ مذاق فرما رہے ہیں یا حقائق کے رُخ سے نقاب اٹھا رہے ہیں۔ عطیہ بیگم کی حیرت ناکی کا ایک واقعہ اُسی اعجوزۂ روزگار کی زبانی سنئے:

"۲۵ر اگست باغ فردوس کی سیر کے لیے مخصوص رکھا گیا جس میں ایک بادشاہ نے مسجد سمیت مُلک مُلک کے معبد بنائے تھے .....
مسجد نما عمارت کی ہیئت بڑی مرعوب کن تھی۔ اللہ کا نام عربی رسم الخط میں

---

[1] ایضاً ص ۹ [2] اقبال ـــــ عطیہ بیگم فیضی ص ۹ [3] ایضاً ص ۲۵

ہر جگہ کندہ تھا۔ میں نے مختلف سورتوں کی متعدد آیات بھی منقش دیکھیں۔

ہر شخص عبارت کے معنی معلوم کرنے کا خواہش مند تھا۔ سو اقبال نے ایک گمبھیر انداز میں عربی کتبوں کو پڑھا، اور ہمیں بتایا جو بقول اُس کے اس جگہ کی تاریخ تھی۔ اقبال نے بتایا کہ جس بادشاہ نے یہ محل بنایا تھا، اسے ایک آسمانی حور ملی، جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا، حور یا اس حسینہ نے کہا: میں تمہاری ملکہ بننا اس شرط پر قبول کروں گی کہ پہلے تم مسلمان ہو جاؤ اور ایک مسجد بناؤ جہاں ہماری رسمِ نکاح ادا ہو۔

بادشاہ نے اس فرمائش کی تعمیل کی، اور اپنے خدام کو ایک مسجد بنانے کا حکم دیا۔ جہاں ان کی شادی سرانجام پائی۔

اقبال نے یہ سب کچھ اتنی متانت سے بیان کیا کہ ہم سمجھ نہ سکے کہ اس کا کیا مطلب لیں۔ البتہ ہم ہندوستانی ہنسے اور محسوس کیا کہ یہ سب کچھ من گھڑت ہے۔ مگر اقبال نے تمام وقت ایسا سنجیدگی کا روپ دھار رکھا کہ باقی سب نے سمجھا کہ جو کچھ اس نے کہا، وہ ایک تاریخی واقعہ ہے [1]

دورانِ قیام یورپ میں علامہ اقبال کی مشقِ سخن کمال پر پہنچی ہوئی تھی تحقیق و مطالعہ کے باوجود شعر گوئی کے لیے وقت نکال لیتے تھے، اور کچھ نہ ہوا تو دل بستگی کے لیے کچھ مزاحیہ اشعار ہی فکر رسا نے فضا میں اُچھال دیئے۔ عطیہ بیگم فیضی کا مشاہدہ ملاحظہ فرمائیے:

"اس شام ڈنر پر ہماری ایک مہمان تھی، جس کی سنہری خوبصورت زلفیں تھیں اور عنفوانِ شباب کی وجہ سے چہرے کے رنگ بہت نمایاں تھے، اقبال میری طرف مڑا اور اردو میں بولا ؎

اس کے عارض پر سنہرے بال ہیں ہو طلائی اُسترا اس کے لیے

---

[1] اقبال ـــــ عطیہ بیگم ص ۳۸

میں اس کے ہمہ گیر مزاج پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسے بغیر نہ رہ سکی" [۱]

اِن عینی مشاہدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے وجود کی بُنت میں طنز و مزاح تار و پود کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی شخصیت، مزاج اور نفسیات کی تعمیر و تشکیل میں ظرافت کا پانی چڑھا تھا۔

اقبال نے اپنی اس فکری استعداد سے اپنے کلام کو نئی آب و تاب سے روشناس کرایا ہے۔ طنز و مزاح کا ایک بلند تر معیار قائم کیا ہے جو مشمولہ "بانگ درا" کے ظریفانہ کلام سے قطع نظر اکبر الہ آبادی و ظفر علی خان کے مزاحیہ کلام سے میل نہیں رکھتا بلکہ علوی عطیہ معلوم ہوتا ہے

اقبال کا طنز و مزاح بڑا گمبھیر ہے، بے انتہا سنجیدہ، پُر وقار اور فکر انگیز ہوتا ہے۔ اسلوب میں ٹھہراؤ، لب و لہجہ میں تمکنت اور جان لیوا سادگی ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ طنز و مزاح کے حربے سے کام لے رہا ہے۔ لطفِ سخن یوں ذہنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ ہم محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب اقبال باری تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

تو دانی حیاتِ جاوداں چیست
نمی دانی کہ مرگِ ناگہاں چیست

تو ہم کھو جاتے ہیں، محو ہو جاتے ہیں، گہرے طنز کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا، حسنِ تخیل کی واقعیت اور لطافتِ بیان ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ علامہ اقبال کے طنزیہ اسلوبِ تنقید کا یہ کمال ہے کہ کم سے کم الفاظ، سادہ تر پیرایہ بیان، لیکن خیال میں عظمت و شکوہ جب جودت و ذکاوت کے تیزاب میں ڈھلتی ہے تو یہ علویت حاصل ہوتی ہے۔

اردو ادب میں بقول ڈاکٹر احسن فاروقی لونجائنس کی تعریف کردہ علویت (HY PSOS) کی کوئی مثال نہیں ملتی [۲] لیکن علامہ اقبال کے یہاں لونجائنس نے جن شرائط کی یکجائی کو "علویت در نعت" سے تعبیر کیا ہے ہمیں نظر آتی ہے گو ایسے اشعار مقدار میں زیادہ نہیں ہیں۔

جمیل جالبی لونجائنس اور اس کے (HYPSOS) پر مقالے کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[۱] ایضاً ص ۴۱ [۲] انٹرویو از کامل القادری دوران ماہ ستمبر/اکتوبر ۱۹۷۱ء (غیر مطبوعہ)

"اگر علویت کو محدود نظر سے دیکھا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں،
فن خطابت کے مطابق شاندار طرز ادا" [1]

اِن معنوں میں بھی علامہ اقبال کی خطابیہ شاعری توجہ طلب ہے، اور مندرجہ بالا اشعار میں بھی حُسنِ خطابت کے بانکپن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ارسطو سے ایلیٹ تک، ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۱۵۲

دوسرا باب

ذوقِ لطیفہ

علامہ اقبال سے منسوب بے شمار لطائف ہیں۔ بہت سے لطائف مولانا غلام رسول مہر اور حابد علی حابد سے سن چکا ہوں، ان تمام مجلسی لطائف کا بیان مقصود نہیں اور نہ اندیشہ ہائے دور و دراز اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ان لطائف سے بھی علامہ اقبال کی ذکاوت اور ظریفانہ مزاج کی غمازی ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت کے بعض نفیس پہلوؤں کے رُخ سے نقاب اُٹھتی ہے۔ ان کے اخلاق و کردار کے بعض گوشے بجلی کی طرح لہراتے نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ علامہ اقبال سے منسوب لطائف کی بھی تنقیح ہو اور کوئی ایسا بندوبست کیا جائے کہ ان میں اور لطیفوں کا میل نہ ہونے پائے۔ شوقِ لطیفہ گوئی میں اکثر ثقہ حضرات کو بھی کسی کا لطیفہ کسی سے منسوب کرتے دیکھا گیا ہے۔

علامہ اقبال کے لطائف تازہ و نو دمیدہ (ORIGINAL) پھول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کا من و عن تحفظ ضروری ہے۔ قیام کیمرج کے زمانے کا ایک لطیفہ سنئے :

"کیمرج کے زمانے میں چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے: مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیانِ مذہب دنیا میں آئے، وہ بلاشبہ استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا

نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "بھئی! شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پیترا جمالیا۔ اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اس لئے پیغمبر جو اللہ کی طرف سے آئے ہیں، ایشیا میں مبعوث ہوئے۔

وہ صاحب بول اُٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ انہوں نے جواب دیا "یہ تمہارے میکیاولی اور مشہور اہلِ سیاست اسی کے رسول ہیں"[1]

ایک اور لطیفہ سنئے۔ اس میں علامہ اقبال کی بُردباری، تحمل، ضبطِ نفس لیکن استقامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لطیفے کی جان اُن کا یہ ذومعنی جملہ ہے کہ "مجھے تو سرے سے نماز کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا" ملاحظہ فرمائیے:

"ایک گفتگو میں جو انھوں نے غالی اہلِ حدیث سے کی، فرمایا کہ میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو خوب معلوم ہے کہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔

اس پر صاحب ذرا گرم ہو کر کہنے لگے "اگر اس طرح حدیث سے بے پروائی کی جائے گی تو مسلمانی ختم ہو جائے گی۔ ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو نماز ایسی روزمرہ کی چیز کے لیے ہمیں کوئی تفصیل نہیں بتاتا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ اہلِ قرآن نے اپنے لئے عجیب قسم کی نمازیں تراش لی ہیں، جن کا جمہور اہلِ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی نمازوں کے اوقات، اذکار اور رکعات وغیرہ سب عالم اسلامی سے مختلف ہیں۔ کیا ایسی حالت میں آپ ان کو کافر نہ کہیں گے"

ڈاکٹر صاحب نے اس تیز کلامی کے جواب میں نہایت نرمی

---

[1] آثارِ اقبال ص ۶۰-۵۹، اقبال کامل ص ۹۲۔

سے فرمایا "کافر نہ کہو، کوئی اور نام رکھ لو، یہ شدّت ہے۔ تم لوگ نمازوں کی رکعات و اذکار پر لڑتے ہو مجھے تو سرے سے نماز کا وجود ہی کہیں نظر نہیں آتا"[1]

علامہ اقبال کی خاص ادا مندرجہ ذیل لطیفے میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ استدلال کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ کج بحثی نہیں کرتے بلکہ ذکاوت و ظرافت سے کام لیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

ایک بار کشمیری خاندان کے ایک شخص کاٹھیاوار کے کسی خاندان میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کو منع کیا اور کہا کہ پنجاب کی کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کریں۔

اس پر ایک نوجوان طالب العلم نے اعتراض کیا کہ آپ تو ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذات پات کی تفریق مٹا دینی چاہیے، کیوں کہ ہماری ذات صرف اسلام ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر جواب دیا یہ تو بالکل صحیح ہے لیکن خواجہ اگر وہاں شادی کرلیں تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہوگی اور اس طرح اس خاندان سے وہ صباحت رخصت ہو جائے گی جو کئی پشتوں سے اس کی خصوصیت چلی آرہی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بچے نہایت خوش رو اور سرخ و سپید ہوں، تاکہ ہم لوگ صحیح معنی میں ملّتِ بیضا بن جائیں[2]

یہ اور ایسے بہتیرے لطائف علامہ اقبال کے میلانِ طبع تک رسائی میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح علامہ اقبال کی سپر تھی، جس سے عہد حاضر کے خلاف رزم آرائی میں انھوں نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔

علامہ اقبال کے یہاں جودتِ طبع اور وٹ (WIT) کے اظہار کا سراغ چھپنے سے

---

[1] البیان، دسمبر ۱۹۳۹ء و اقبالِ کامل ۱۹۳۸ء ص ۵۰ [2] آثارِ اقبال ص ۳۶-۳۷ و اقبالِ کامل ص ۹۱-۹۰۔

ہی لگایا جاتا ہے۔ مثلاً دیر سے اسکول آنے کی پرسش پر اُستاد کو اقبال کا یہ مختصر لیکن لطیف جواب کہ
"اقبال دیر ہی سے آتا ہے" ؎۱

غالب اور سر سید احمد خاں کے یہاں بھی جودتِ طبع' وٹ' برجستگی اور حاضر جوابی نظر آتی ہے۔ غالب اپنی عام زندگی میں، خطوط میں اور کہیں کہیں کلام میں بھی بڑے دُوہ نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں بھی شوخیٔ طبع کا فطری میلان پایا جاتا ہے جو فارسی اور اردو کلام سے کہیں زیادہ خطوط میں جا پا سکتا ہے۔

علامہ اقبال اور غالب کے لطائف میں جو ذکاوت وظرافت کی بُرّاقی پائی جاتی ہے، اس میں بڑی وقعیت، والہانہ پن اور لطائف کے علاوہ بھی ایک ادا ہے، جسے پُروقار سنجیدگی (HIGH SERIOUSNESS) تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ غالب واقبال دونوں کے یہاں وٹ مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کے بُن دمو میں ظرافت کا عرقِ تابِ سرباد دکی طرح چمکتا رہتا تھا۔ لوگ لطیفے یوں گھڑتے ہیں جیسے سنار گہنے گڑھتا ہے، لیکن علامہ اقبال کی برجستہ گوئی لطیفہ بن جایا کرتی تھی۔ مثلاً علامہ اقبال کے ایک جگری دوست چودھری شہاب الدین تھے، وہ چوٹی کے وکیلوں میں تھے، لیکن ناٹے کھوٹے اور رنگ آبنوسی ــــــــ قیدار کے خیموں اور سلیماں کے پردوں کی مانند سیاہ فام۔ علامہ اقبال کی ان سے چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، خلیفہ عبدالحکیم اور عابد علی عابد سے اِن کے بارے میں متعدد لطیفے سُن چکا ہوں جن میں بعض ناگفتنی بھی ہیں۔ بعض گفتنی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:

- ایک مرتبہ اقبال چودھری شہاب الدین کے گھر گئے تو چودھری صاحب غسل خانے میں نہا رہے تھے اور نالی سے سیاہ پانی بہہ رہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی سیاہ روشنائی کی دوات نالی میں پڑی تھی، شہاب الدین نہا کر باہر نکلے تو معذرت کرنے لگے "مُعاف کیجئے میں نہا رہا تھا"

؎۱ اس لطیفے کے اصل مرجع کا راقم الحروف کو علم نہیں۔

علاّمہ اقبال نے کہا "میں سمجھ گیا تھا کہ آپ نہا رہے تھے۔"

چودھری صاحب نے پوچھا "آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نہا رہا تھا؟"

علامہ اقبال نے کہا، غسل خانے کی نالی میں کالا پانی جو بہہ رہا تھا" [۲]

- ایک مرتبہ چودھری شہاب الدین وکیلوں والا سیاہ سوٹ پہن کر بار روم میں آئے۔ اقبال انہیں دیکھتے ہی بولے "چودھری صاحب! یہ کیا؟ آج آپ ننگے ہی چلے آئے" [۱]
- ایک دن چودھری صاحب سیاہ کے بجائے سفید سوٹ پہن کر آئے تو اقبال انھیں دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے

چودھری صاحب نے پوچھا، "کیوں بھئی تم ہنسنے کیوں لگے؟"

اقبال بولے، "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہیں یا کپاس کے کھیت میں ارنا بھینسا!" [۳]

- ایک دن چودھری شہاب الدین کو دیکھ کر اقبال نے کہا "چودھری صاحب آپ واقعی سچے مسلمان ہیں"

چودھری صاحب نے پوچھا، "تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں سچا مسلمان ہوں؟"

اقبال نے برجستہ کہا "دیکھئے مسلمان کی تعریف یہ بھی ہے کہ اس کا ظاہر اور باطن ایک سا ہوتا ہے الحمدللہ! آپ کا ظاہر و باطن بھی ایک سا ہے (یعنی آپ اندر باہر کالے ہی کالے ہیں)" [۴]

---

[۱] سراج نظامی نے "گھر" کے بجائے اس لطیفے کا محلِ وقوع کالج کا ہوسٹل بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "اقبال نے کالی روشنائی کی دوات غسل خانے کی باہر والی نالی میں انڈیل دی" (تعلیم و تربیت اپریل ۱۹۷۳ء) زمان و مکان کی تبدیلی سے علامہ اقبال کی شخصیت کے دو الگ رنگ سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ طالب علمی کے زمانے میں بھی علامہ اقبال شوخ تھے اور چودھری شہاب الدین اور علامہ اقبال ایک ہی زمانہ میں ہوسٹل میں رہتے تھے۔ دوم یہ کہ یہ اتفاقی امر نہ تھا بلکہ علامہ اقبال نے دوات دانستہ غسل خانے کی نالی میں انڈیل دی تھی۔ یعنی علامہ اقبال کی ایک پُر لطف شرارت تھی یہ ——— بڑے لوگوں کے لطیفوں کے راوی بدلنے کا یہ رجحان مناسب نہیں۔ اس سے اس کی تاریخی اہمیت متاثر ہوتی ہے [۲] موج ظرافت مرتبہ حنیف شاہد ص ۸۔

• جن دنوں چودھری شہاب الدین لاہور بلدیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ مہتر چترال لاہور تشریف لائے۔ لاہور بلدیہ کمیٹی نے ان کی ضیافت کی۔ لاہور کے معززین و معتبرین سے مہتر چترال کا تعارف کرانے کی خدمت اقبال کے سپرد ہوئی۔ سب سے پہلے شہاب الدین کی باری تھی، کیوں کہ وہ ان دنوں بلدیہ کمیٹی کے صدر تھے۔

اقبال نے والیٔ چترال کی طرف منہ کرکے فرمایا "یہ ہیں مہترِ چترال" اور چودھری صاحب کی طرف منہ کرکے کہا "اور یہ ہیں مہترِ لاہور"

جاننے والے جان گئے کہ اقبال نے کیسی عمدہ پھبتی کسی ہے [۱]

• علامہ اقبال ایک دفعہ بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ چودھری صاحب کا ذکر چھڑ گیا تو کہنے لگے "میں نے عالم خیال میں ایک بڑھیا دیکھی جو اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا تو کون ہے؟ کہنے لگی" طاعون ہوں" میں نے کہا" تو بھاگ کر کہاں جا رہی ہے؟ کہنے لگی" میں شہر کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن وہاں شہاب الدین پہلے ہی موجود ہے۔ میری کیا ضرورت رہ گئی [۲]

• علامہ اقبال کے چند اور لطائف ملاحظہ فرمایئے، جو نہ صرف ان کی ذکاوت و جودت و شوخی و طراریِ طبع کی غمازی کرتے ہیں بلکہ اُن کے اسلوبِ حیات کے بھی آئینہ دار ہیں، سراج نظامی لکھتے ہیں:

• اِن دنوں بعض کالجوں کے طلبا میں بننے ٹھننے کا بڑا شوق ہوا کرتا تھا۔ لڑکے لڑکیوں کی طرح خوب بن سنور کر کالج جاتے اور شام کو بڑے ٹھسّے سے سیر کرتے۔ ایک دفعہ چند طلبا اقبال رح کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پردے کے موضوع پر بات چل نکلی۔

لڑکے بولے "ہماری رائے ہے کہ عورتوں کو پردہ ہٹا دینا چاہیئے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

علامہ اقبال بولے "آپ عورتوں کا پردہ ہٹانا چاہتے ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ اب

---

[۱] تعلیم و تربیت اپریل ۶۸ء / دموج ظرافت [۲] ایضاً [۳] و [۴] ایضاً

کالجوں کے طلبا کو بھی پردے میں بٹھا دینا چاہیے۔"[1]

• علامہ اقبال اپنی نو تعمیر کوٹھی "جاوید منزل" میں اُٹھ آئے تھے۔ عقیدت مندوں کا اب یہاں بھی جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان کے عقیدت مندوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں سے پنجاب کے ایک بہت بڑے پیر بھی تھے۔

ایک دفعہ ایک پیر صاحب ڈاکٹر صاحب کے یہاں کھانے پر مدعو تھے، چند اور احباب بھی جمع تھے، کھانے کے بعد رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں، اتنے میں پیر صاحب کا ایک دیہاتی مرید پوچھتا پچھاتا وہاں پہنچ گیا۔ آتے ہی اُس نے مریدانہ سلام کے بعد اپنے کھدّر کے تہ بند کی گرہ سے دو روپے نکال کر پیر صاحب کے نذر کیے۔ اور عرض کی یا حضرت دُعا کریں کہ میرا سو روپیہ قرض اُتر جائے۔

پیر صاحب ابھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ علامہ اقبال نے پہل کر دی اور بڑے خلوص سے دعا مانگنا شروع کر دی "یا اللہ! اپنے حبیب کے صدقے اس غریب کا وہ قرضہ جو پہلے سو روپیہ تھا اور اب پیر صاحب کی برکت سے ایک سو دو روپے ہوگیا ہے، بے باق کر دے۔"

(اس وقت علامہ اقبال کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پیر صاحب کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔)[1]

• عبداللہ چغتائی سے علامہ اقبال کا بڑا لگاؤ تھا۔ ان کی ملاقات کے منتظر رہتے، ان کی باتیں سنتے اور محظوظ ہوتے، اگر ان سے ملاقات ہوئے زیادہ مدت ہو جاتی تو خود انھیں بلاتے۔ ایک بار چغتائی صاحب عرصے کے بعد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا "عبداللہ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟"

اُنھوں نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! کیا عرض کروں، آج کل اس قدر مصروفیت ہوتی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی اور فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا۔"

علامہ اقبال نے اس جواب پر بے اختیار قہقہہ لگایا اور فرمایا، "عبداللہ! تم نے آج وہ بات کہی ہے جو آئن سٹائن کے باپ کو بھی نہیں سوجھی ہوگی۔"[2]

---

[1] موج ظرافت مرتبہ محمد حنیف شاہد ص ۸۰ [2] تعلیم و تربیت اپریل ۱۹۹۰ء ص ۳۱

• جب مانٹیگو چمسیفورڈ اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا تو اسی زمانے میں متحدہ ہندوستان میں صوبائی کونسلوں اور مرکزی اسمبلی کے عام انتخابات بھی شروع ہو گئے۔ ان دنوں کسی شوخ طبع اور من چلے کو جو شوخی سوجھی تو اس نے ایک مصرعہ موزوں کر دیا ؎

ووٹ حاضر ہے اگر چلنے کی پیالی مل جائے

یہ مصرعہ آناً فاناً لاہور میں زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے بھی کسی نے ازراہِ تفنن طبع یہ مصرعہ دہرایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مصرعہ کو سنتے ہی برجستہ فرمایا ؎

چلبلی، شوخ، طرح دار، نرالی مل جائے
نوجواں مرتے ہیں جس پر وہی بالی[1] مل جائے

• علی بہادر حبیب اللہ کے والد شیخ محمد حبیب اللہ سیدن پور ضلع بارہ بنکی کے مشہور تعلقہ دار تھے، اور اودھ کے دوسرے تعلقہ داروں کی طرح لکھنؤ میں رہا کرتے تھے، ان دنوں بچوں کو ولایت بھیج کر تعلیم حاصل کرانا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی، چنانچہ بہادر بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ عالم کم سنی میں لندن بھیجے گئے، آٹھ سال کی عمر میں لندن جانا اور پورے سال بعد وہاں سے وطن واپسی اس زمانے میں یقیناً غیر معمولی بات تھی، پھر علی بہادر حبیب اللہ نے تو ہندوستان آتے ہی بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا چنانچہ جب ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے لاہور آئے اور ڈاکٹر اقبال سے بطور خاص ملاقات کی، تو ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا "کیوں بھئی ولایت سے ہو آئے"

اس کے جواب میں وہ فخریہ انداز میں بولے "جی ہاں، میں تو آٹھ سال کی عمر میں انگلینڈ چلا گیا تھا"

اس جواب کو سن کر ڈاکٹر صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی، ان سے نہ رہا گیا۔ مسکرا کر کہا،

---

[1] عبدالمجید سالک، مولانا مہر، عابد علی عابد [2] عبدالمجید سالک [3] عبدالمجید سالک، وہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور کے رؤسا خصوصاً نوجوانوں میں شہر کی مشہور مغنیہ اقبال بیگم عرف بالی کی بڑی دھوم تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کس شوخی اور ندرت کے ساتھ اس نام (بالی) کو منظوم کیا اور حصول ووٹ کو حصولِ طوائف کے برابر سمجھا۔ ان کے اس انداز بیان میں اس وقت کے معاشرے پر کس قدر بھرپور طنز ہے۔ نیز دیکھئے "موج ظرافت" ص ۲۱۔

پھر تو آپ کو یوں کہنا چاہئے ؎

میموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں [1]

• وفات سے پہلے جب وہ زیادہ بیمار ہوئے تو بڑے بڑے حکیموں نے آپ کا علاج کیا اور آپ کو غذا میں پرہیز کرنے کو کہا۔ آپ کو آم بہت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل آتی تو آپ جی بھر کر بڑھیا آم کھاتے۔ اب جو پرہیز کرنا پڑا تو عجب مشکل میں پھنس گئے۔ حکیم صاحب سے آم کھانے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو حکیم صاحب نے منع کیا لیکن علامہ صاحب کا اصرار دیکھ کر حکیم صاحب نے صرف ایک آم کھانے کی اجازت دے دی۔

ایک دن کوئی دوست آپ سے ملنے آیا تو دیکھتا ہے کہ ایک بہت بڑا آم جس کا وزن آدھ سیر یا تین پاؤ ہوگا، اقبال کے سامنے رکھا ہے اور وہ مزے لے لے کے کھا رہے ہیں۔ وہ بولا "علامہ صاحب! یہ کیا ستم کر رہے ہیں۔ آم سے تو آپ کو پرہیز بتایا گیا ہے۔"

علامہ اقبال ہنس کر کہنے لگے "بس ایک ہی تو ہے' ایک آم کی اجازت تو حکیم صاحب نے دے رکھی ہے۔" [1]

• ایک مرتبہ اکبر الہ آبادی نے ان کے لئے لنگڑا آم کی ایک پیٹی بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی رسید میں یہ شعر لکھ دیا ؎

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا [2]

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا غلام رسول مہر۔

[1] تعلیم و تربیت مقالہ سراج نظامی ماہ اپریل ۱۹۶۸ء ص ۲۱ [2] مولانا غلام رسول مہر نیز "مبح ظرافت" ص ۲۹۔

تیسرا باب

خطوط بولتے ہیں

علامہ اقبال کے خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ خطوط میں حاشیہ کی باتیں نہیں کرتے۔ وہ مکتوب علیہ کو کم سے کم الفاظ میں زیرِ نظر مسئلے کے بارے میں خبر پہنچاتے ہیں۔ اکثر خط مختصر اور کیفیت احوال پر مشتمل ہے۔ علمی نکات کی وضاحت اور شرح و تفسیر کہیں کہیں ہے لیکن وہ ادبی چاشنی نہیں جو انشا پردازی کے بطن سے بروز کرتی ہے۔ بہ ایں ہمہ بعض خطوط میں فطری حُسنِ ظرافت کا رنگ اُبھرا اُبھرا نظر آتا ہے۔ عطیہ بیگم فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کل رات میں عرش پر گیا تھا، اور مجھے دوزخ کے دروازے سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے وہ مقام ہیبت ناک طور پر خنک لگا۔ مجھے متعجب دیکھ کر ملائکہ نے بتایا کہ یہ جگہ اگرچہ اپنی فطرت کے اعتبار سے خنک ہے، لیکن دیکھنا آخر آخر دہکنے لگے گی، کیونکہ ہر شخص دنیا سے اپنی آگ آپ لاتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ سوختنی کوئلہ جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، کیوں کہ عالم بالا میں کوئلے کی کوئی زیادہ کانیں نہیں" [1]

---

[1] علامہ اقبال کا ایک خط عطیہ بیگم فیضی کے نام؛ "اقبال" عطیہ بیگم فیضی ص ۵۳

علامہ اقبال کے یہاں پُر وقار سنجیدگی کے پردے میں رُوحِ ظرافت بولتی ہے۔ کس متانت و وقار کے ساتھ عطیہ بیگم فیضی کو بنایا ہے جو اس وقت تک دوشیزہ عطیہ تھیں۔ افتتاحی اور آخری فقرے پر توجہ فرمائیے کس طرح گمبھیر لب و لہجہ میں زعفران کی خوشبو حل ہوگئی ہے۔ عرش پر جانے کے لئے دوزخ کے دروازے سے گزرنے کی شرط بڑی معنی خیز ہے۔

علامہ اقبال کے ایک شاگرد ڈاکٹر غلام عباس علی خاں لمعہ جاگیردار ٹونڑہ پور تھے۔ ان کا مذاقِ سخن نرالا تھا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مرتبہ "نارو" کے درد میں مبتلا ہوئے تو فرمایا:

نارو کے درد کا بھی عطیہ ہمیں ملا
یہ درد کیا ہے، تارِ محبت کا سلسلہ
ہے سوز اس میں آتشِ نمرود کا نہاں
سوزش بھی اس کی سُودِ محبت کی ہے زباں

ایک اور نظم کے دو شعر سنئے کہ اس پر علامہ اقبال نے اصلاح فرمائی ہے۔ حضرتِ لمعہ فرماتے ہیں ؎

لمعہ ہے نیپٹن ہے اور آرزوئے وصال ہے
مشقِ خرام نیپٹن موسمِ برشگال ہے[1]
ساحلِ نیپٹن پہ آج عشق کا اور حال ہے
لب پہ سرِ دری سرودِ حسن سے قیل و قال ہے

حضرت لمعہ اکثر علامہ اقبال کو کلام اصلاح کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ علامہ اقبال سُنتِ غالب پر کاربند اصلاح فرما کر لوٹا دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ لمعہ نے اپنی علالت کا خط لکھا۔ علامہ اقبال کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ انھوں نے دل جوئی کرتے ہوئے لکھا:

---

[1] علامہ اقبال نے یہ مصرعہ یوں بدل دیا "موجیں ہیں نور ونور کی موسم برشگال ہے"

"کیا آپ کو بروقت ایک گُر بتادوں! شعر و سخن میں کم وقت صرف کیجئے تو آپ کی صحت کو فائدہ پہنچے گا" [1]

علامہ اقبال کے مشورے کی افادیت سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے۔

مخدوم الملک سید غلام میران شاہ نے بغیر تحقیق حال اپنے "اطمینان قلب" کا ذکر کیا۔ علامہ اقبال نے جواباً لکھا

"عراق کی جانب جو راستہ جاتا ہے، اس کے متعلق پورے طور پر تحقیق فرمایئے۔ مجھ کو تو یہی معلوم ہوا ہے کہ یہ راستہ اچھا نہیں اور وہاں کی سرکاری اطلاع بھی یہی ہے کہ بیمار آدمی اس راستے سے سفر نہ کرے۔

باقی رہا آپ کا اطمینانِ قلب سو آپ کو معلوم ہے کہ اطمینانِ قلب ذکرِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ذکرِ الٰہی آپ کے آبا و اجداد کی میراث ہے سب نے یہ طریق انھیں سے سیکھا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ آپ کی میراث ہے میں آپ کے چہرے میں آثارِ سعادت دیکھتا ہوں۔ کوئی شخص آپ کو آپ کی میراث سے محروم نہیں کرسکتا"

علامہ اقبال کے شعورِ مزاح کی جھلکی ایک اور خط میں ملتی ہے۔ اس میں بظاہر ایک واقعہ لکھا ہے لیکن حاضر جوابی ملاحظہ فرمایئے "کیا ہیٹ پہننے سے اسلام تشریف لے جاتا ہے" علامہ اقبال خط میں لکھتے ہیں ؎

"ایک نوجوان مصری دوکاندار سے میں نے سگریٹ خریدنے چاہے، اور باتوں باتوں میں اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں، مگر میرے سر پر چونکہ انگریزی ٹوپی تھی، اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا "تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو! (تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا) جب وہ میرے

---

[1] اقبال نامہ ص ۲۷۰ خط مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۳۲ء

اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا "تم بھی مسلم میں بھی مسلم تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

میں نے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے اسلام تشریف لے جاتا ہے!

کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی داڑھی منڈی ہو تو ترکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہئیے، ورنہ اسلام کی کیا علامت ہوگی"۔ [۱]

علامہ اقبال ایک خط میں فرماتے ہیں:

تدردِ نقرس نے پائے قلم اور پائے عمل دونوں کو لنگ کر رکھا ہے۔ زمانے کی ہوا بیماریوں میں بھی جمہوریت کی روح پھونک رہی ہے۔ ورنہ نقرس کو امرا کی بیماری ہے، ہم فقیروں سے کیا کام؟

بہرحال خدا کا شکر ہے:

یہ بھی ترا کرم ہے کہ نقرس دیا مجھے
صحت میں گو فقیر، مرض میں امیر ہوں [۲]

علامہ اقبال کی سوانح، مجلسی حالات، لطائف اور خطوط سے ان کی ظریفانہ طبیعت کا بدرجۂ اتم اندازہ ہوتا ہے۔ وہ حیوانِ ظریف تھے، بُت طناز تھے اور ان کی یہ خصوصیت پُر وقار سنجیدگی، شائستگی، اور فکری بالیدگی کے پہلو بہ پہلو اُن کے کلام میں بھی باریاب ہوئی، جس کا تحلیل و تجزیہ کیا جانا چاہئیے۔ اور نکتہ بلیغ پیشِ نظر رکھنا چاہئیے کہ ظرافت کے ہزاروں روپ ہیں اور پھر ان روپوں کے ہزاروں چھب ہیں، ظرافت اپنے وسیع تر معنوں میں نہ صرف "ہنسی ٹھٹھول" ہے اور نہ عامیانہ و سفلی جذبات و احساسات کی تسکین کا ذریعہ ہے اور نہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا زائد توانائی کے اخراج کا وسیلہ [۳] یہ اسلوبِ حیات بھی ہے، اور اسلوبِ نقد بھی۔ علامہ اقبال کے یہاں اس کے نت نئے روپ چھب کا اب مطالعہ کیا جانا چاہئیے۔

---

[۱] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۶۵ خط بنام محمد دین فوق مورخہ ۲۵ ردسمبر ۱۹۰۵ء از کیمبرج [۲] خط بنام مدیر اخبار الخلیل بجنور ۲۴ راپریل ۱۹۲۲ء [۳] "تنقید اور احتساب" نیز "نئے مقالات"۔

چوتھا باب

رنگِ اکبر کی حقیقت

بانگِ درا میں مشمولہ ظریفانہ کلام کا تخلیقی عہد زیادہ سے زیادہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء پر منتہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی سال اکبر الہ آبادی نے علامہ اقبال کو اس "پوچ گوئی" سے منع کیا تھا اور علامہ اقبال نے اسے بصد احترام و عقیدت اپنے ممدوح کی پیروی محض قرار دی تھی [1] علامہ اقبال منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی اس انداز کے شعر کہا کرتے تھے، اور یہ محض تفننِ طبع یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ عالی دماغ شاعر کی ذہنی آوارہ خرامی کی حیثیت رکھتی تھی، اِسے وہ نہ خود محفوظ رکھتے تھے اور نہ رکھنے دیتے تھے، بنگال کی تقسیم پر علامہ اقبال نے ایک قطعہ عطیہ بیگم فیضی کو لکھ بھیجا۔ ذرا شوخیٔ طبع تو دیکھئے ؎

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتہ سے دہلی آگیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی [2]

---

[1] دیکھئے علامہ اقبال کا خط بنام اکبر الہ آبادی مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۱۲ء مطبوعہ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵-۳۴۔
[2] اقبال ــــ عطیہ بیگم فیضی، اقبال کا خط مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء

ایسے قطعات اور شعر نہ معلوم کتنے ہوں گے جو کہے اور ایک قہقہے میں اڑا دیے گئے۔ علامہ اقبال محض خوش طبعی کے لیے کہا کرتے تھے، ان پر اکبر الہ آبادی کے مذاق سخن کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اسی زمانے میں ظفر علی خاں بھی اکبر الہ آبادی کے کاربن کاپی بننے کی کوشش کر رہے تھے بہ ایں ہمہ علامہ اقبال پر تقلید محض کی تہمت مزاج سخن شناس نہیں لگا سکتے۔ علامہ اقبال کا فنی شعور اکبر سے وسیع تر تناظر میں ابھرا تھا۔ جس میں رفعت، شائستگی اور شوخی کے عناصر کا نہایت حسین امتزاج ملتا ہے ؎

"اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے"
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکر غیر کیا؟
کیوں اے جناب شیخ سنا آپ نے بھی کچھ
کہتے تھے کعبہ والوں سے کل اہل دیر کیا؟
ہم پوچھتے ہیں مسلم عاشق مزاج سے،
الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے بیر کیا؟

سرمایہ داری، جاگیرداری، ساہوکاری کے مظالم اور انسانیت کش اقدامات کو جس شوخیٔ طبع سے علامہ اقبال نے موضوع سخن بنایا ہے، اس کا ادنیٰ پرتو بھی شعور اکبر پر نہیں پڑا تھا۔ علامہ اقبال نے ان موضوعات پر غور و فکر کی ظریفانہ لب و لہجہ میں دعوت دی ہے جس میں دردمندی کی ایک خفی لہر بھی پائی جاتی ہے ؎

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست
ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹے بٹے ایک ہی تھیلے کے ہیں
ساہوکاری، بسوہ داری، سلطنت

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اور تجارت سے مسلم ہند کی بے رغبتی پر علامہ اقبال یوں اسے متوجہ کرتے ہیں ؎

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

اور ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب و عصبیت پر یوں طنز کرتے ہیں ؎

کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے نوکدار سینگ

وہ ملک جو صارفین کی حیثیت اختیار کرے گا معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا، ضروری ہے کہ صنعتی ترقی کی جانب توجہ کی جائے اور ملکی مصنوعات کو فروغ دیا جائے اس نکتۂ بلیغ کو علامہ اقبال نے یوں ظریفانہ اسلوب میں پیش کیا ہے ؎

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے، کفن جاپان سے

مضامین اور پیرایہ بیان دونوں اعتبارات سے پیش کردہ مثالوں کو رنگِ اکبر سے کوئی ربط نہیں اور نہ اسے پوچ گوئی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے بعض نظمیں رنگِ اکبر میں کہی ہیں جن میں مضامین بھی فرسودہ ہیں اور اکبر ہی کی طرح انگریزی الفاظ بطور قوافی لائے ہیں، لیکن ان میں بھی علامہ اقبال اکبر کے تابع مہمل تو نہیں

ایہام گوئی کا مزہ لیجیے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے، نہ خنجر ہے، تو قصدِ خودکشی کیسا؟
یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ "اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرائے پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

انگریزی تو افی برتنے کا سلیقہ اکبر کے مماثل ہے "گولی" کی ایہامی کیفیت مدِنظر رہے

تہذیب کے مریض گولی سے فائدہ؟
دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے!

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دِل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"

"فلیٹ" کی قافیہ بندی کا مزہ لیجئے ؎

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر
حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے

مغرب میں ہے جہازِ بیاباں شتر کا نام
ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

سرمایہ داروں کے تکیہ کی پھبتی کا لطف اٹھایئے ؎

سُنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پُرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

علامہ اقبال عملی سیاست کا بھی تجربہ رکھتے تھے۔ الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت کی منزلوں سے آشنا تھے اور ان کے حصول کے لیے جو لوگ پاپڑ بیلا کرتے تھے، اس کے عینی شاہد لہٰذا انھوں نے سیاسی حرب و ضرب کے میدان سے بھی ظرافت کے پھول چُنے ہیں۔ طبقہ نسواں جب کونسل کی ممبری کے لیے میدانِ عمل میں نکل آیا تو علامہ اقبال نے اس کے ذوق و شوق کی یوں داد دی ؎

یہ کوئی دن کی بات ہے، اے مردِ ہوش مند!
غیرت نہ تجھ میں ہوگی، نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دَور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

کیا یہ دَور نظروں کے سامنے آنہ چکا! اکبر سے علامہ اقبال کی نگاہ زیادہ دوررس تھی، لہٰذا انھوں نے نئی تہذیب کے انڈے کو گندہ کہا تھا، اور اکبر کی بہ نسبت یہ وہی کہہ سکتے تھے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے یورپ کو بہ چشم خود دیکھا تھا اور ان کی نگاہِ دُوربیں ان تضادات پر پڑ چکی تھی جو سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے جنم لے رہے تھے، سرمایہ دارانہ نظام کی فلک بوس دیواروں میں لُونی لگ چکی تھی، یورپ میں اخلاقی دیوالیہ پن نے غیرت وحمیت کے انسانی معیاروں کو ملیا میٹ کر دیا تھا اور جسم کو آزاد اور رُوح کو پَرشکستہ کر دیا تھا جب بھی کسی ملک کسی تہذیب، کسی معاشرے میں ایسی بے اعتدالی سر اٹھاتی ہے تو اس کا انجام تباہی ہوتا ہے، اہلِ رومی کا حشر علامہ اقبال کے سامنے تھا، ان کی نظر یورپی ممالک خصوصاً جرمنی میں ہونے والی انقلابی تبدیلی کو دیکھ رہی تھی۔ لہٰذا اس نئی تہذیب کو انہوں نے گندے انڈے سے تشبیہ دی کہ یہ تخلیقی جوہر کھو چکی تھی۔ کیا مزے میں فرماتے ہیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

علامہ اقبال نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے جو کچھ بھی کہا ہے، اس میں بھی اُن کے فکر ونظر

کی روشنائی اور فنی نزاکتیں گھُلی ملی نظر آتی ہیں۔ ان میں لطافتِ خیال بھی ہے، رفعتِ تخیل بھی ہے، اصلاحِ حال کے لیے دردمندی بھی۔ مثلاً پیشہ ور مصنفین، واعظ اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں علامہ اقبال کا رویہ بڑا ہمدردانہ ہے۔ وہ اُن کی حالت پر ترس کھاتے ہیں۔ ہر چند میری نظر میں اعلیٰ درجہ کی ظرافت میں ترس کا جذبہ نہ ہونا چاہیئے۔ بہرکیف علامہ اقبال کا دردمند دل فن کے تقاضوں کا زندانی کبھی نہیں ہوا

دیکھئے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک
شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیمِ جدید
میرا سر جن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
رَدِّ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

بہرکیف علامہ اقبال کی ظرافتِ طبع کا یہ ایک روپ ہے۔ آئیے اب دوسرے روپ پر نظر کریں۔

پانچواں باب

ظریفانہ اسلوبِ تنقید کا اِرتقا

علامہ اقبال کے کلام میں شوخی و ظرافت کا نمک ابتدا ہی سے موجود تھا۔ داغ سے علامہ اقبال کی ارادت بے وجہ نہ تھی، ان کی تربیت نے علامہ اقبال کے کلام میں ایک خاص بانکپن پیدا کر دیا تھا۔ جس کا سرسری اندازہ داغ کے رنگ میں علامہ اقبال کی چند غزلوں سے بھی ہوتا ہے اور شیخ عبدالقادر کے اس بیان سے بھی۔

"ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انھیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اُنھوں نے کہہ سُن کر ایک غزل بھی پڑھوائی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی، سادہ الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی۔ مگر کلام میں شوخی اور بیساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی ——" [1]

---

[1] دیباچہ "بانگ درا" ص ۱۲

"بانگِ درا" میں علامہ اقبال کے کلام کا ابتدائے مشقِ سخن سے حدِ سنہ ۱۹۲۴ء[1] سے قبل کا منتخب کلام شامل ہے۔ اِس میں فکر و نظر کی گوناگوں تجلیاں بھی ہیں، شوخیٔ طبع کا رنگ بھی ہے اور لطافتِ خیال بھی۔ واعظ سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے اور اس کے کردار پر چبھتی تنقید بھی۔ مثلاً ؎

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
علاوت ہے اسے سارے جہاں سے

اُمیدِ حُور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

اور یہ شعر تو نادر طنزیہ اسلوب کا نمونہ ہے۔ کس قدر پہلو بچا کر واعظ کے خود ساختہ تصورِ الٰہیہ پر چوٹ کی ہے ؎

بٹھا کر عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد کی ایک غزل میں واعظ سے نباہ محال ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی نظر میں وہ کوتاہ بیں، نشۂ غرورِ زہد سے چُور، مُفتۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اسے اپنے دربارِ غزل سے رخصت کر دیتے ہیں ؎

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

---

[1] "بانگِ درا" کا یہ سالِ اشاعت ہے، گویا ظاہر ہے کہ اس سے قبل کا ہی کلام اس میں ہوگا۔

واعظ سے رسم و راہ رسمی نہ تھی لہٰذا جب اُس کی چُھٹی کی تو جودتِ طبع نے اور کرداروں کا انتخاب مشقِ نازک سے کیا۔ ایسے کردار جو زیادہ جاندار اور واعظ سے کہیں زیادہ قابلِ ملامت تھے۔ زائرینِ کعبہ سے ان کا یہ معنی خیز چبھتا ہوا سوال اُن کی ذکاوت و ظرافت کے ساتھ ان کے اندر تغیر پذیر فکری جہت کی غمازی کرتا ہے۔ یہی وہ طنزیہ اسلوبِ تنقید ہے جو نشو و ارتقا پا کر بے پناہ گھمبیر ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیے غزل کا شعر ہے :

زائرینِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حَرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں

سنہ ۱۹۰۷ء کی کہی ہوئی ایک غزل میں یہی اسلوب پیغمبرانہ بشارت اور تنذیر کی صورت میں رونما ہوا۔ اقبال کی سادگی میں بھی شمشیر جوہر دار کی بُرّاقی پائی جاتی ہے ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

علامہ اقبال کے لب و لہجہ کا تیکھا پن اس شعر سے بھی ترشح کرتا ہے ؎

تجھے کیوں فکر اے گل! دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

اور یہ طنزیہ اسلوبِ تنقید "شکوہ" میں ہمہ جمال و ہمہ جلال کے ساتھ غارت گر ہوش و تمکین بن کر اُبھرا ہے۔ اس کی بدیہی وجہ تو یہ ہے کہ "شکوہ" بلحاظ ہیئت "واسوخت" ہے۔ ہر ہیئت کے بعض اپنے مطالبات ہوتے ہیں، حدود اور سرحدیں ہوتی ہیں، جن سے پہلو بچانا محال ہوتا ہے۔ قبلۂ سخن کی تبدیلی کے باوجود ہیئت کی گرفت بہت مضبوط نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا ؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا !

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

آئے عشّاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

اقبال کے "شکوہ" کی لَے میر کے واسوخت سے مل جاتی ہے [1] یوں بھی واسوخت جارحانہ عشق کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔

جواب شکوہ میں بھی اقبال کا زورِ کلام رفعت پر ہے، اور کیوں نہ ہو کہ شاعر کا

---

[1] مقالہ "واسوخت میر اور "شکوۂ اقبال" از کامل القادری مطبوعہ امروز (غالباً فروری) ۱۹۵۶ء نیز نگار پاکستان" کراچی۔ جون۔ جولائی ۱۹۶۸ء

منصب خدا کی جانب سے آدمِ خاکی کے اٹھائے گئے سوالوں کا جواب دینا ہے۔ بعض نقاد اور سخن فہم عموماً اسے "شکوہ" کے ہم پلہ نہیں سمجھتے، لیکن میں نے بار بار پڑھا اور محاسنِ شعری کا تجزیہ و مقابلہ کیا، یہ ایک دوسرے کا آئینہ ہے۔ زورِ بیان، لطافتِ خیال، حسنِ تخیل میں دونوں ہی میں یکساں علویت و رفعت پائی جاتی ہے۔ دونوں میں صنائع و بدائع یکساں دلکشی و رنگینی پیدا کرتے ہیں، دونوں میں مسدس کی قوتِ تعمیر یکساں قیامت خیز ہے۔ میری نظر میں "شکوہ و جوابِ شکوہ" نہایت نادر طنزیہ اسلوب تنقید میں لکھی ہوئی نظمیں ہیں، جن میں جوش و ولولہ، جذبہ، محاکات و دقعیت اور یک گونہ نفاست و شائستگی ہے۔ چند ابتدائی بند جواب شکوہ کے ملاحظہ فرمائیے ؎

پیرِ گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی!
بولے سیارے، سرِ عرشِ بریں ہے کوئی!
چاند کہتا تھا، نہیں، اہلِ زمیں ہے کوئی!
کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی!
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا!
عرش والوں پہ کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟
آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟
غافل آداب سے سکّانِ زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے

عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے
ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

کیا کیف و سرور کا موجیں مارتا دریا نگاہوں میں پھر گیا، کس قدر شوخ اور پُر حدت وحرکت محاکاتی انداز ہے۔ اب شکوہ سنج انسان کی حقیقت بھی سن لیجئے ؎

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے، فقط وعدۂ حور
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

عدل ہے خاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

علامہ اقبال کے رفع شعورِ مزاح کی چھوٹیں شکوہ و جوابِ شکوہ پر یکساں پڑ رہی ہیں۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح مناسب نہیں نہ فہمیدہ تنقید ایسے نتیجے کا استنباط کر سکتی ہے۔

"ساقی نامہ" علامہ اقبال کی ایک ایسی مثنوی ہے، جس میں علامہ اقبال کے فکر و نظر کے جملہ مقدمات و مہمات اور زبان و طرزِ ادا کی ساری خصوصیتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ علامہ اقبال کے شعورِ مزاح کی جھلکیاں اس میں بھی ہیں۔ کٹیلے فقرے، چبھتی تنقید، نرم چٹکی ——— ملاحظہ فرمائیے ؎

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بُتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

علامہ اقبال کا یہ طنزیہ اسلوب اور تیکھا لب و لہجہ ان کی فکری ظرافتِ طبع کی دین ہے تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ اور فکر و نظر کی ٹھوس آہنی کرسیوں نے اس عمارت کو تاثر یا سڈول پہنچایا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ رنگ علامہ اقبال کے فارسی کلام میں بھی اپنی پوری مجبوریت اور قہرمانی کے ساتھ در آیا ہے۔ لطافتِ خیال نے سادگی کا جوڑا پہنا ہے لیکن ایسی سادگی جس پر ہزار بناؤ نثار ہوں شوخی و مزاح اُس وقت بے پناہ ہوتا ہے جب مواد و ہیئت ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک جان ہو جاتے ہیں۔

چھٹا باب

ضربت کاری کے مقامات

اقبال بہت شوخ و شنگ شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، فقرہ بازی، اور طنز میں خندۂ سحر کی صباحت پائی جاتی تھی۔ لب و لہجہ میں نرمی، لوچ اور گداز پایا جاتا تھا لیکن یورپ سے واپسی کے بعد علامہ اقبال نے عہد حاضر کے خلاف بغیر اعلان جنگ فرما دی تھا اور تمام فکری و نظری اقدار، معتقدات، ادعیان اور اس سے متعلقہ اداروں اور اشخاص پر نقد و تنقیح کا بیڑا اٹھایا انھوں نے اس ہمہ گیر اور پُرخطر نازک منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسا لب و لہجہ اور اسلوب اختیار فرمایا کہ مزاج کا جلالی روپ کو دے اُٹھا۔ مقصودِ نظر اقوامِ عالم کو درس نمو دینا تھا، اُن کے رگِ افسردہ میں تازہ لہو دوڑانا تھا۔ اور اس کے لیے نوا کو قدرے تلخ کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ علامہ اقبال کو خود اس کا احساس تھا، لہٰذا وہ اپنی تلخ نوائی کے لئے یوں معذرت کرتے ہیں ؎

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کرتا ہے کارِ تریاقی

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

علامہ اقبال کی یہ تلخ نوائی وقعیت کی آغوش کی پروردہ ہے اور اس طرح اُن کے تربیت یافتہ شعور نے طنز و مزاح کے علاقے میں ایک ایسی قدر کا اضافہ کیا ہے، جس سے اردو شاعری آشنا نہ تھی۔ داغ کے یہاں ایک الھڑ قسم کی محبوبانہ اٹکھیلیاں ملتی ہیں، شوخی اور محبوب پر فقرے چست کرنے کا رجحان نظر آتا ہے جو بزلہ سنجی و ظرافت کی سطح تک نہیں پہنچتا۔ اقبال کے یہاں داغ کی خصوصیت بھرپور طنز و مزاح کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں اقبال کے اسلوب کی تشکیل میں داغ کے مثبت اثرات صاف جھلکتے ہیں۔

حافظ اور قدرے غالب نے بھی بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے اپنے اپنے عہد کے سماجی اداروں اور اربابِ بسط و کشاد پر چوٹیں کی ہیں، جملہ چست کیا ہے۔ نام دھرا ہے۔ فقیہ شہر، خضر، واعظ، ناصح، منعم، پیرِ مغاں وغیرہ کے تو اردو اور فارسی شعرا نے مل کر لتے لئے ہیں۔ ان کا مذاق اُڑایا ہے اور طرح طرح سے انہیں رُسوا کیا ہے۔ لیکن اقبال کا اندازِ بیان کچھ اور ہے اور اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت وقعیت کہی جا سکتی ہے۔ اقبال نے جس کے بارے میں جو فقرہ چست کر دیا اُس کی شخصیت و کردار اور اوصاف و معتقدات کے سارے کوائف و خصائص سمیٹ لئے۔ مثلاً افلاطون کے فلسفۂ اعیان پر تنقید مقصود ہے کہ یہ قوت و حرکت سے عاری اور زندگی کی گرمجوشی پیدا کرنے کے بجائے افسردگی و مردنی پیدا کرتا ہے۔ زندگی کے رجائی تصور سے بے بہرہ اور متشائم اندیشے سے بہرہ مند ہے۔ زندگی سے مردانہ وار نبرد آزمائی کے بجائے فرار و گریز سکھاتا ہے۔ ان خیالات کے اظہار کے لیے علامہ اقبال نے طنزیہ اسلوبِ تنقید اختیار کیا ہے اور ابتدا ہی میں افلا ن پر یوں چوٹ کرتے ہیں:

راہبِ دیرینہ[1] افلاطون قدیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم

---

۱ بعض نسخوں میں "اول" بھی آیا ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

گو سفند در لباسِ آدم است

اور ذرا یہ شوخیٔ بیان ملاحظہ فرمائیے ؎

تکیہ بر عقل جہاں بیں فلاطوں نکنم
در کناری دل کی شوخ و نظر بازی بست

پھر زبورِ عجم میں علم فلاطوں کا مذاق اُڑاتے ہیں ؎

یک ذرۂ دردِ دل از علم فلاطوں بہ

واعظ کے مقابلے میں افلاطوں زیادہ زندہ کردار ہے اور اس کا دبدبہ اب بھی قائم ہے، لہٰذا علامہ اقبال کی ان جملہ بازیوں پر حیرت و استعجاب پیدا ہوتا ہے اور ہم علامہ اقبال کے ان کٹیلے فقروں کی معنویت کی تلاش میں اُن کے نقد و نظر کا مطالعہ کرنے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں۔

یونان کی عقلیت پرستی سے اقبال کا گریز معنی خیز ہے، لیکن ہر چیز ثابت نہیں کی جاتی، محسوس بھی کی جاتی ہے۔ مولانا حالی نے غم دل کے علاج کا نسخہ کسی بقراط سے پوچھوایا تھا وہ صنعتی عہد اور یورپی تہذیب و تمدن کے افتتاح کا زمانہ تھا۔ حالی اور سرسید صنعتی انقلاب کی برکتوں یعنی سائنس اور ٹکنولوجی سے ہمکنار ہونے ہی میں برِّ عظیم میں مسلمانوں کے کھوئے وقار کی بحالی کا خواب دیکھ سکتے تھے لیکن علامہ کی زمزمہ خوانی بیسویں صدی میں بال کشا ہوئی۔ وہ یورپی تہذیب کے تناقض سے باخبر ہو چکے تھے، وہ جہانِ اسلام اور اقوام عالم کو درسِ نمو کا ایک نیا منشور دینے کے خواہش مند تھے۔ اور اس نئے سفر میں فکر و نظر کی دولتِ بیدار کے علاوہ طنز و مزاح بھی زادِ راہ بنا۔ انھوں نے افراد، ادارے، افکار، معتقدات پر بے لاگ تنقید و تنقیح فرمائی۔ میری نظر میں ان کے پائے کا نہ عہد حاضر کا سماجی نقاد ہے اور نہ اتنی جھلائی ہوئی شخصیت کا مالک۔ وہ تن تنہا چوکھی لڑے اور شش جہات کا مقابلہ کیا۔ افلاطون کا کیا مذکور، ان کے خدنگ ظرافت سے کون بچا ہے۔ مارکس، نٹشے، حافظ، صوفی، ملّا، امام، موذن، واعظ، گاندھی، جمہوریت، ملوکیت، اشتراکیت، جبرئیل، فرشتے، خداوند بزرگ

دبرتر ——— بڑی طویل فہرست ہے۔ طنزیہ اسلوبِ تنقید لاجواب ہے۔
کارل مارکس پر یوں طنز کرتے ہیں ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر ست
قلبِ او مومن، دماغش کافر است
دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

طنز کا کس قدر خوبصورت اسلوب ہے: پیغمبرِ بے جبرئیل، قلب او مومن، دماغش کافر ست اور بر مساواتِ شکم دارد اساس۔ اور سجع گوئی کے فن سے کس قدر ملتا جلتا طنزیہ اسلوب ہے۔ کس قدر وقعیت اور جامعیت ہے۔ ایسی فقرہ بازی پر مارکس کا ایک پرستار بھی بے اختیار ہنس سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے مارکس کے جملہ خصائص کو کم سے کم لیکن چبھتے ہوئے الفاظ میں پیش کر دیا۔

علامہ اقبال نے "اسرارِ خودی" لکھتے ہوئے عجمی تصوف کے غیر حرکی اور انفعالی و متشائم جہات کی بھی شدت سے مخالفت کی ہے۔ حافظ کے کلام میں بھی منفی و مثبت دونوں اقسام تصوف مانندِ دولاب گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اُس پر بھی طنز کی ؎

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ او
از دو جام آشفتہ شد دستارِ او

چوں جرس صد نالہء رسوا کشید
عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملّتِ میخوارگاں
آں امامِ ملّتِ بے چارگاں
گوسفندیست و نوا آموختہ ست
عشوہ و ناز و ادا آموختہ ست

آج سے ساٹھ ستّر برس پہلے حافظ کو "گوسفند" قرار دینا جرارت کی بات تھی۔ علامہ اقبال نے یہ جسارت جس لب و لہجہ میں کی، اس کا ردِ عمل ہوا۔ پورے ہندوستان میں صدائے "بزن بزن" کی گونج سنائی دینے لگی۔ کسی خاں بہادر نے بزعمِ خویش "اسرارِ خودی" کے جواب میں "رازِ خودی" فرمادیا اور اس میں اقبال کو "شغال"، "رہزنِ اسلام"، "دشمنِ اسلام" وغیرہ کہا۔ علامہ اقبال نے افلاطون کو گوسفند در لباسِ آدم کہا تھا۔ صاحبِ "رازِ خودی" نے فنِ مبالغہ کا مظاہرہ فرمایا۔

"جبرئیلے در لباسِ آدم است"

علامہ اقبال کے اس طنزیہ اسلوبِ تنقید نے ایک قیامت کھڑی کر دی۔ اسلم جیراجپوری اکبر الہ آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی ایسی ثقہ شخصیتیں بھی اقبال کی پشت پناہی نہ کرسکیں، اور بالآخر اقبال نے حافظ کے بارے میں اپنا فقرہ واپس لے لیا لہ لیکن اُس وقت تک یہ فقرہ اپنا کام کر چکا تھا۔ فکر و نظر کی ایک نئی جہت پیدا ہو چکی تھی۔ لہٰذا "رموزِ خودی" میں جب علامہ اقبال نے صوفی پر بحیثیت طبقہ یوں طنز کیا تو کوئی چوں نہ بولا ؎

صوفیِ پشمینہ پوش حال مست
از شرابِ نغمہء قوال مست

لہ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۴۔ ۵۳ خط بنام اکبر مورخہ ۱۸ جون ۱۹۱۸ء۔ اسرارِ خودی میں حافظ پر جو کچھ لکھا ہے اس کو خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں۔

وعظ پر طنز کیا ؎

وعظ دستاں زن افسانہ بند
معنی اُو پست و حرف بلند

حقیقتِ توحید سے مسلمانوں کی بے خبری پر یوں طنز کیا ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام

میر سپہ پر یوں طنز کیا ؎

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپر دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

امامِ مسجد پر یوں چوٹ کی ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

مقامِ نبوت کی حقیقت کو یوں طنزیہ انداز میں سمجھایا ؎

وہ نبوت ہے مسلمانوں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

مسلمانوں کی بے عملی و افسردگی پر یوں تبصرہ فرمایا ؎

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

تن آساں نوجوانوں پر یوں لہو روئے ؎

ترا صوفہ ہے افرنگی، تری قالیں ہے ایرانی
لہو رُلواتی ہے مجھ کو جوانوں کی یہ تن آسانی

اقبال نے جس کاٹ دار لب و لہجہ میں تنقید فرمائی ہے اور طنز و مزاح کے جو نو بہ نو پہلو پیدا کئے ہیں، اس سے پہلے اردو میں کہاں تھے! پھر اقبال کا طنز دردمندانہ وقعیتِ حال کا حامل ہے، لہٰذا ابتدا میں جس اسلوب سے لوگ بدکے تھے، بعد میں وہی اُن کا ہنر ٹھہرا اور علامہ اقبال اپنی ہمہ گیر تنقیدی مہم میں اس ہتھیار سے کام لیتے رہے۔

علامہ اقبال مروجہ طریقۂ تعلیم کو ناقص سمجھتے تھے۔ اس پر اپنے مخصوص لب و لہجہ میں یوں تنقید فرمائی ہے ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا اِلحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

یہاں علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کی لَے مِل جاتی ہے۔ ایک اور نظم ملاحظہ فرمائیے ؎

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دَور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

یہی نہیں، بلکہ موجودہ تعلیم صرف معاش کا ایک ذریعہ ہے اور معاش ہی فکر و نظر کا رُخ متعین کرنے میں فیصلہ کُن فیکٹر کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے، اس فکرِ معاش نے تمام

اقوام کو اپنا غلام بنالیا ہے

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

لہٰذا علامہ اقبال ایسے مدرسے سے دُور رہنے کی تلقین کرتے ہیں جو فکر و نظر اور جسم و روح کو غلامی پر کمربستہ کرتا ہے ؎

نوا از سینۂ مرغِ چمن بُرد
زِ خونِ لالہ آں سوزِ کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ بازی
کہ نان در کف نداد و جان زتن برد

ایسے مکتب اور ایسی دانش سے علامہ اقبال دُور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے جو کفِ دست پر روٹی کا ایک ٹکڑا رکھ کر جان و تن سلب کر لیتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں علم و دانش کا حقیقی مقصد حصولِ معاش نہیں بلکہ حریت اور آزادیٔ افکار ہے، جس کے بغیر انسان کی تخلیقی صلاحیتیں بروے کار نہیں لائی جا سکتیں۔ لہٰذا عہدِ حاضر کے مکتب اور دانش گاہوں سے فارغ التحصیل لوگوں پر بڑی دردمندی کے ساتھ یوں تنقید کرتے ہیں ؎

گلا تو گھونٹ دیا، اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا۔ لا الٰہ الا اللہ

یہ بُتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

علامہ اقبال کے طنزیہ اسلوبِ تنقید کے متنوع پہلو ہیں، طبقۂ نسواں پر علامہ اقبال نے مختلف پیرایہ میں تنقید کی ہے، جس سے طبقۂ نسواں میں یہ بدگمانی پائی جاتی ہے کہ نیٹشے کی طرح علامہ اقبال بھی عورتوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ امر واقعہ یہ نہیں ہے، علامہ اقبال نے اعلیٰ صفات خواتین کے بھی گُن گائے ہیں مثلاً فاطمہ بنت عبداللہ۔ وہ عہد حاضر کی مغرب زدہ عورتوں سے البتہ وحشت کھاتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے بے خبر ہو چکی ہیں۔ طبقۂ نسواں کی اصلاح حال کے وہ بہت خواہاں ہیں۔ ایک مختصر نظم میں عورت کی صفات کی ثنا خوانی کرتے ہوئے فرمایا ؎

مقالاتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

بظاہر اس بیانیہ سادہ سے شعر میں تیر و نشتر کا گمان نہیں ہوتا لیکن وہ سخن فہم جو تلمیح لطیف سے بے خبر نہیں، اسے ہجو ملیح قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے۔ علامہ اقبال نے نہایت مہذب و شائستہ لب و لہجہ میں بہ فنِ بلاغت عورتوں کی فطرتِ حیلہ گر پر طنز کی ہے۔

برصغیر کے فن کاروں پر بھی علامہ اقبال نے توجہ فرمائی ہے۔ وہ شعر و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے فعالی قوت کا بہ کُل ادراک رکھتے تھے لیکن اسے کسی اعلیٰ مقصود کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ افادی ادب کا نظریہ رکھتے تھے۔ وہ علم و فن جو تعمیرِ خودی میں معاون ہو مباح ورنہ کسی بیوہ کا شیونِ ناشنیدہ ؎

من نمی گویم کہ آہنگش خطاست
بیوہ زن را ایں چنین شیون رواست

اس خیال کا اظہار علامہ اقبال نے یوں بھی کیا ہے:

"میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالکِ اسلامیہ میں
قابلِ اصلاح ہے۔ (PESSIMISTIC LITERATURE)
_____ کبھی زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی
کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا (OPTIMISTIC)
ہونا ضروری ہے [1]

علامہ اقبال نے علم و ادب کے بارے میں اپنے اس نظریئے کے پس منظر میں اپنے ارد گرد عشق و مستی کا جنازہ دیکھا تو فرمایا ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اِن کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا فرار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

علامہ اقبال نے سیاسی مفکر کی حیثیت میں عہد حاضر کے اوضاعِ حکومت پر شدید تنقید کی ہے، جس میں ان کا اسلوب خاصا طنزیہ ہے لیکن وقعیت اور پُروقار سنجیدگی کی فضا پائی جاتی ہے۔ مختلف نظام ہائے سیاسی، ملوکیت، اشتراکیت، جمہوریت، قومیت (نیشنلزم) پر طنز کی ہے اور اُن کے تضادات باطنی کو اُجاگر فرمایا ہے۔ جمہوریت پر علامہ اقبال کی پُر لطف تنقید ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۲-۵۳، خط بنام اکبر مورخہ ۱۱ جون ۱۹۱۰ء

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

پھر فرماتے ہیں ؎

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک اور مقام پر جمہوریت کی ہجو بڑی شائستگی سے کرتے ہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے، یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

"خضرِ راہ" کے اسی بند میں "سلطنت" کی حقیقت طنزیہ اسلوب میں بیان فرماتے ہیں ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ اَیاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

"سرمایہ و محنت" کے رمز کو طنزیہ اسلوب میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تری برات!
دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مُسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

سرمایہ داری کو اقبال شرفِ انسانی کے لیے ایک لعنت سے کم نہیں سمجھتے۔ اس کی طرح طرح سے ملامت کی ہے۔ سرمایہ دار پر طنز کا ایک اچھوتا پہلو ملاحظہ فرمایئے ؎

بدوشِ زمیں بارِ سرمایہ دار
ندارد گذشت از خور و خواب کار

جہاں راست بہروزی از دستِ مُزد
ندانی کہ ایں ہیچ کار است دُزد

گویا سرمایہ دار گدھ ہے جس کا اذوقہ دوسروں کی محنت پر منحصر ہے، شیر خود شکار کر کے کھاتا ہے۔ علامہ اقبال محنت کی شرف کے زمزمہ خواں تھے۔ میاں نکھٹو کے طرف دار نہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

سرما کے ہواؤں میں ہے عریاں بدن اُس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

"لیگ آف نیشن" پر علامہ اقبال کی یہ تنقید بھی اسی وقعیت کی حامل ہے ؎

برفتد تا روش ازم دریں بزم کہن
دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اقبال کی نظر میں ملوکیت اور جمہوریت سے اشتراکیت بہتر ہے۔ ابلیس کے مشیر اس سے ہراساں، بہت زیادہ ہراساں ہیں کہ اس نے مساوات کو قائم کر دیا ہے ؎

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیمِ بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

لیکن علامہ اقبال پرولتاریہ ڈکٹیٹر شپ کو فریب تخیل سمجھتے ہیں، وہ طنز فرماتے ہیں ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست
آں تیشۂ فرہادے، ایں حیلۂ پرویزے

اقبال ملوکیت کو اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھتے ہیں اور حیرت ہے کہ صوفی و ملّا اسی کے دام میں اسیر ہیں، لہٰذا انھیں پھٹکارنے کے لیے ابلیس کو اشارہ کرتے ہیں ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام

انسانی صفات و جبلتوں کی حرارت و حدّت سے پُر زندگی سے فرشتے ناآشنائے محض ہیں۔ وہ بندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور اسی وظیفے میں مگن۔ یہاں اس نکتۂ بلیغ پر بھی توجہ چاہیے کہ اقبال غلامی کے دشمنِ جانی ہیں خواہ یہ ذہنی غلامی ہو یا تمدنی یا سیاسی۔ اُن کا منتہائے نظر حصولِ قوت و اقتدار ہے جو آرزومندی کے بیج اور عشق کی ہوائے اثر خیز سے بتدریج بالیدگی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس نہالِ خودی کی نشوونما ارتقا کے لیے آزادی ضروری شرط ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال آزادارادیت (FREE WILL) کو شرفِ انسانی کے لیے ناگزیر بتاتے ہیں۔ فرشتے کی خو میں بندگی ہے۔ لہٰذا اس کی اس فطری و خلقی کمزوری پر علامہ اقبال نے طنز کے لیے اُن کے معلّمِ اخلاق کو چُنا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو ، اللہ ہُو ، اللہ ہُو ،

علامہ اقبال قوت و اقتدار کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں، گاندھی جی کا برت ہو یا اہنسا، وہ جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات تجویز کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے برت کا وہ یوں مذاق اُڑاتے ہیں ؎

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

قوت و اقتدار کا حصول ضمیر و ایماں اور قلب و دماغ کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں، اور اِن اوصاف کو حضرت سلیمان کی طرح اس انگوٹھی سے تشبیہ دی ہے جس کی وجہ سے انہیں اقتدار حاصل تھا۔ شیطان نے بلطائف الحیل اُسے اُڑا لیا۔ وہ مفلس و قلاش ہو گئے۔ علامہ اقبال کو طنز کا موقعہ مِل گیا۔ لطافتِ خیال توجہ طلب ہے ؎

آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختہ
ہم بہ جبرئیل امیں نتواں کرد گرد

اور اس طرح یہ مضمون پیدا کیا کہ تم نے ضمیر و ایماں اور قلب و دماغ کو اس دَور کے شیطان کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں اس قدر قیمتی ہیں کہ جبرئیل کے ہاتھ بھی گروی نہیں کی جا سکتیں

علامہ اقبال ایک اور مقام پر جبرئیلِ امیں کو بھی جھڑک دیتے ہیں۔ ذرا اقبال کی پُر لطف جھڑکی ملاحظہ فرمائیے ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

گویا علامہ اقبال نے اپنے طنزیہ اسلوب کی دھار زمین و آسماں کی تمام نمائندہ شخصیتوں، مسائل اور احوال و ظروف پر آزمائی ہے۔ یہاں تک کہ وہ باری تعالیٰ کے حضور بھی اپنی جودتِ طبع

اور شوخیٔ و ظرافت سے باز نہ رہ سکے۔

اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ علامہ اقبال کا تصور الٰہ عام توحید پرستوں سے بہت کچھ الگ ہو گیا ہے[1] وہ خدا کے قرآنی تصور یعنی اُسے قادرِ مطلق اور اکمل ماننے کے بجائے خدا کو ارتقائی قوت و سیلان کہتے ہیں۔ گویا خدا کائنات کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ارتقا کے منازل طے کرتا ہے[2] ظاہر ہے اس خلاّقی اور ارتقائی قوت و سیلان کو اسلام کے شخصی خدا سے کوئی نسبت نہیں ہے گویا فلسفیانہ اصطلاح میں علامہ اقبال کا خدا ماورائی (TRANSCENDENTAL) نہیں بلکہ سریانی (IMMINENT) ہے اور یہ فرق بڑی معنویت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کی باری تعالیٰ کے حضور زیادہ تر شوخیاں، طنزیہ اور حریفانہ تخاطب و کلام، اور بذلہ سنجی و فقرہ بازی کا مسالا بھی سریانی خدا کے تصور سے اُنہیں ہاتھ لگا ہے اور ایک خاص اسلوب میں علامہ اقبال نے خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں نت نئے انداز میں طنز و مزاح کے پہلو پیدا کئے ہیں۔

---

[1] فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ص: ۲۰۳ [2] تشبیہاتِ ردی از خلیفہ عبدالحکیم ص ۹۰ [3] اقبال کا علمِ کلام از سید علی عباس جلال پوری ص ۷۰

ساتواں باب

بندۂ گستاخ

باری تعالیٰ کے حضور میں علامہ اقبال کی نیازمندانہ شوخیوں اور طنزیہ فقرے میں بڑی دلکشی و جاذبیت ہے اور اس اہتمام و سلیقہ کے ساتھ ہے کہ لطف تو لیا جا سکتا ہے لیکن اقبال پر انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی۔ بہ ایں ہمہ اہلِ زمانہ کی بے خبریوں اور تنگ نظریوں کا اقبال کو بکمال احساس تھا، لہٰذا بطور پیش بندی اپنے آپ کو حرفِ ملامت بنا لیا۔ اُسے کوئی کیا کہے گا جو خود اپنا مذاق اُڑانے کا حوصلہ رکھتا ہو ؎

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

باری تعالیٰ کے حضور میں شوخیٔ طبع اور لاگ لپٹ کا اقبال نے جو مظاہرہ کیا ہے، اس میں بڑی حلاوت ہے، شیرینی ہے، لطافت ہے۔ اس میں جارحانہ تنقید کا وہ بلند بانگ لب و لہجہ اور طنزیہ اسلوب قدرے نرم پڑ گیا ہے، جس کا پچھلے باب میں ہم تفصیلی مطالعہ کر چکے ہیں۔ وہ طنز و مزاح زیادہ موثر ہوتا ہے، جب اس بات کا پتا نہ چلے کہ یہ طنز و مزاح ہے۔ اقبال کے چٹکی لینے کا انداز ملاحظہ فرمائیے ؎

ما از خدا گم شدہ ایم او بہ جستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو ست

خدا قادرِ مطلق ہے لیکن وہ موت کی لذّت سے آشنا نہیں، اقبال چٹکی لیتے ہیں۔ اے خدا تو حیاتِ جاوداں سے تو آشنا ہے لیکن مرگِ ناگہاں کا تو نے ذائقہ نہیں چکھا ہے ؎

تو می دانی حیاتِ جاوداں چیست
نمی دانی کہ مرگِ ناگہاں چیست

بڑی دقعیت ہے۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ خدا بندے کے انتظار میں ہے ؎

درونِ سینۂ ما دیگری چہ بوالعجبی است
کرا خبر کہ توئی باکہ ما دو چار خودیم
کشائے پردہ از تقدیرِ آدمِ خاکی
کہ ما بہ رہ گزر تو در انتظار خودیم

اقبال کی نیاز مندانہ شوخیاں مختلف احوال و ظروف میں نمایاں ہوتی ہیں ایک مقام پر وہ اپنی ودیعت کردہ تخلیقی قوت کی زمزمہ خوانی کرتے ہوئے خود کو بھی چھوٹے خالق کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں اور کبھی باری تعالیٰ پر فرماں روائی کرتے نظر آتے ہیں ؎

بادِ بہار را بگو پی بہ خیالِ من برد
وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں
زادۂ باغ و راغ را از نفسم طراوتی
در چمن تو زلیستم با گل و خار ایں چنیں
عالم آب و خاک را بر محکِ دلم بسائے
روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں

دل بہ کسے نہ باختہ با دو جہاں نہ ساختہ
من بہ حضور تو رسم روز شعار ایں چنیں

دوسری جگہ انسان کی ہمت و جگر داری کا اس شوخی کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے نظار گی کی دعوت دیتا ہے ؎

اے خدا مہر و مہ خاکِ پریشانی نگر
ذرۂ در خور خرد پیچد بیابانی نگر

"یا چنیں کن یا چنیں" سے بھی اقبال کی شوخیٔ طبع جھلکتی ہے، بھلا اقبال خدا کو مشورہ دینے والے کون ہوتے ہیں؟ لیکن وہ کہتے ہیں، ایسا کر دگر نہ ایسا کر ؎

یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں در کف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
یا چناں کن یا چنیں
یا برہمن را بفرما تو خداوندے تراش
یا خود اندر سینۂ زنّاریاں خلوت گزیں
یا چناں کن یا چنیں
یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں
یا جہانے تازہ یا امتحانِ تازہ
می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں

فقر بخشی، با شکوہ خسروِ پرویز بخش
یا عطا فرما خرد یا فطرتِ روح الامیں
یا چناں کن یا چنیں
یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زماں و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

علامہ اقبال کارِ خدا میں یونہی دخل انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیاز مندانہ شوخی کے ساتھ کائنات کی خلقی خامیوں کو مزے لے لے کر شمار کرتے ہیں۔ خدا سے اُن کے "شکوہ" کا یہ لب و لہجہ ملاحظہ فرمائیے، اُردو شکوہ (مشمولہ بانگ درا) سے کس قدر مختلف ہے۔ کتنی پُر وقار سنجیدگی، شائستگی اور وقعیت سے خدا کے کام میں نقص نکال رہے ہیں ؎

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابانِ جنوں بردی و در سوا ساختی
جرم ما یک دانۂ، تقصیر او یک سجدۂ
نے بہ آں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی
صد جہاں می روید از کشتِ خیال ما چو گل
یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختی
طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

یہاں لب و لہجہ میں تندی و تیزی نہیں، آہنگ میں فخامت بھی نہیں، نرم رَو، سبک گام چشمے کی گنگناہٹ پائی جاتی ہے۔ لیکن معنوی سطح پر ظرافت کی لہر یوں تابندہ نظر آتی ہے جیسے تابِ سرِ بادہ۔ علامہ خدا سے "آدم پختہ تر" تخلیق کرنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ فرمائش میں کیا مضائقہ

ہے ؛ معصومانہ خواہش کا اظہار ہے اور بس۔ لیکن ذرا ٹھہر کر دیکھئے، کس مزے سے آدم اوّل کو خدا کی ناقص تخلیق قرار دے دیا ہے۔ اقبال کی شوخیٔ طبع کی یہ واحد مثال نہیں۔ وہ یونہی چپکے سے چٹکی لے لیا کرتے ہیں ؎

نقشِ دگر طراز دہ، آدمِ پختہ تر بیار
لعبتِ خاک ساختی می نہ سزد خدائے را

حضرتِ آدم علیہ السلام شیطان کے دھوکے میں آجاتے ہیں، تو اقبال وکالت فرماتے ہیں، ذرا طرزِ استدلال کی خوبی اور عذر داری کا رنگ ملاحظہ فرمائیے ؎

جہاں از خود بروں آوردہ کیست
جمالش جلوہ بے پردہ کیست
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ او پروردہ کیست

علامہ اقبال کی اٹکھیلیاں نت نئی ہیں، وہ کبھی معنی آفرینی سے بھی ظریفانہ رنگ پیدا کرتے ہیں۔ مرنا برحق ہے۔ ہر ذی حیات کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ علامہ اقبال اس میں یوں شاخ لگاتے ہیں کہ یار و مرنا ہے تو یوں مرو کہ اللہ میاں بھی یاد کریں کہ انھوں نے کیسی نادر و نافع تخلیق کو فنا سے ہم آغوش کر دیا ہے۔ اقبال کس بانکپن سے کہتے ہیں ؎

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

ماسوا رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) علامہ اقبال کے شعورِ مزاح کا ہدف حیات و کائنات اور ماورائے کائنات کی ہر شئے اور شخصیت ہے۔ خدا، جبرئیل، فرشتے، ابلیس، صوفی، ملّا، واعظ، مفتی، فقیہ شہر، امام، موذن، افلاطون، نیٹشے، مارکس، لینن، گاندھی، سرمایہ دار، ہینگ فروش آغا، شیخ، برہمن، طبقۂ نسواں، شاعر و صورت گر و افسانہ نویس، کون بچا ہے۔ پھر عہدِ حاضر کے جملہ سیاسی و فلسفیانہ افکار و اقدارِ حیات پر علامہ اقبال نے نہایت کٹیلے لب و لہجہ میں تنقید فرمائی ہے۔

علامہ اقبال کی تنقید کے حسن و قبح اور دریافت حال سے قطع نظر اُن کے طنزیہ اسلوبِ تنقید کا تجزیہ کیا جائے اور الفاظ کے در و بست، نکتہ آفرینی، معنی بند مضمون یابی اور معنوی عُمق سے اُبھرتی ہوئی ظرافت کا احساس کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ علامہ اقبال کا شعورِ مزاح علویت و رفعت کی ساری خصوصیتیں رکھتا ہے۔ پُر وقار سنجیدگی، توازن، وقعیت، تعمیری قوت، لطافتِ خیال، تخیلِ بلند پرواز اور حُسنِ بیان باہم قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح بِل مجل کر وحدتِ تاثر کی تخلیق کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً کراماً کاتبین کے غیر ضروری تعینات پر اقبال کی شکوہ سنجی کا انداز دیکھئے ؎

گناہِ ما چہ نویسند، کاتبانِ عمل
نصیبِ ما ز جہاں تو جُز نگاہی نیست

آٹھواں باب

علامہ اقبال کا اسلوب

خروشِ حیات کا دوسرا نام علامہ اقبال کا اسلوب ہے۔ وہ بڑے وٹی (WITTY) تھے۔ جدت طبع اور ذکاوت میں اُن کا جواب نہیں، بزلہ سنجی، فقرہ بازی، ہجو ولطیفہ گوئی، پھبتی، ایہام، چٹکی، شوخی وشرارت، اور گہرا فکرانگیز پُروقار ومتین طنز کے نمونے پیش کئے جاچکے، ان سے علامہ اقبال کی زندگی اور ادب کے بارے میں رجائی تصور پر روشنی پڑتی ہے

علامہ اقبال نے عہد حاضر کے خلاف بغیر اعلان ۱۹۰۱ء ہی سے جنگ شروع کردی تھی لیکن اس کا اعلان ۱۹۳۶ء میں "ضرب کلیم" کی اشاعت کے موقع پر فرمایا۔ انھوں نے اعلان جنگ بے وجہ نہ کیا تھا ان کی نگاہوں کے سامنے یورپی تہذیب کے تضادات اور باطنی تناقضات آچکے تھے۔ وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے خواہاں تھے، ایسی دنیا جس میں "خودی" انسان کا مطمحِ نظر ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے نظریۂ خودی کی وضاحت وتبلیغ کے لیے فکر ونظر کا دامن تھاما اور دوسری طرف انھوں نے عہدِ حاضر پر تنقید وتبصرہ کے لیے طنز ومزاح کے حربوں کی قوت کو انگیخت کیا اور ان دونوں کے حسین امتزاج نے اُن کی بے پناہ تنقیدی صلاحیت کو ایک نئی توانائی بخشی جس میں نفوذ پذیری کا جوہر بھی شامل تھا۔ اُن کا طنزیہ اسلوب تنقید ان ہی اجزاء سے مرکب ہے۔

علامہ اقبال کے اسلوب کی ہمہ گیر معنویت کا احساس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زُبان، ادب اور فنِ شاعری کے متعلق علامہ اقبال کی آرا پر غور کریں۔ جہاں تک میری نظر پہنچ پائی ہے میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال کا مقصودِ نظر محض صحتِ زبان یا فنّی لحاظ سے چار کھونٹ درست شاعری یا تغزل نہ تھا بلکہ وہ اپنی شاعری کو اعلیٰ تر مقصد یعنی حیات و کائنات میں انقلاب برپا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ علامہ کے اس موقف کی تائید اُن خطوط سے بھی ہوتی ہے جو اپنی زبان پر اعتراض کرنے والے معترضین کے جواب میں انھوں نے لکھے ہیں۔ ایک سے زیادہ مقامات پر انھوں نے اپنے ادبی نصب العین کو "زبان" اور "ادب" سے ماورا بتایا ہے۔ مثلاً :

"زبان" کے متعلق میرا نقطۂ نگاہ اور ہے مگر اس میں جہاں لوگ علم اللسان جدید سے واقف نہیں، وہ نقطۂ نگاہ بدعت سمجھا جائے گا۔ اس واسطے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔"[1]

دوسرے خط میں اپنے ایک نکتہ چیں کو لکھتے ہیں :

"شعر محاوروں اور بندش کی درستی اور چُستی کا نام نہیں، میرا ادبی نصب العین نقاد کے ادبی نصبُ العین سے مختلف ہے، میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانہ کے شعرا میں میرا شمار ہو۔"[2]

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :

"زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، اور جب

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم خط بنام پروفیسر سوار محمد مورخہ ۶ مارچ ۱۹۲۵ء ص ۲۵۸۔ [2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۵۲ بنام شوکت حسین مورخہ ۲ جنوری ۱۹۲۶ء

اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے، ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔"[1]

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

"زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے بلکہ فنِ شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں"[2]

زبان و فنِ شاعری کے بارے میں علامہ اقبال نے اِن خطوط میں جن آراء کا اظہار فرمایا ہے، ہر چند اُن کے مخاطب وہ معترضین ہیں جو علامہ کی زبان پر انگشت نمائی کیا کرتے تھے، تاہم ان سے بھی علامہ اقبال کے زبان و ادب کے بارے میں صحت مند رجحان کی غمازی ہوتی ہے۔ زبان و ادب سے اپنی لاعلمی و لاتعلقی محض انکسار ہے، عملاً وہ اتنے لاتعلق اور بے پروا نہ تھے۔ انھوں نے زبان پر بھی توجہ فرمائی ہے، ترکیبوں کی تراش خراش میں بھی ذوقِ جمال کو بروئے کار لایا ہے اور طرزِ ادا کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا ہے۔ البتہ اُن کا نقطۂ نظر مجتہدانہ تھا، محض لغات، صنائع و بدائع اور علم عروض و قوافی کے جھمیلوں میں الجھا ہوا نہ تھا۔ انھوں نے زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کیا ہے۔ آل احمد سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تیمور کی روح سے اپیل کرنے سے تیموریت کو زندہ کرنا مقصود نہیں، بلکہ وسط ایشیا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے، تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوبِ بیان ہے۔ اسلوبِ بیان کو شاعر کا حقیقی (VIEW) تصور کرنا کسی طرح درست نہیں، ایسے اسالیب کی مثالیں دنیا کے ہر لٹریچر میں موجود ہیں"[3]

---

[1] اقبال نامہ ص ۵۰ خط بنام سردار عبدالرب نشتر مورخہ ۱۹ راگست ۱۹۲۳ء [2] ایضاً ص ۴۷-۴۵۔ خط بنام پروفیسر شجاع مورخہ ۲۰ رجنوری ۱۹۳۱ء [3] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۱۵ خط بنام آل احمد سرور مورخہ ۱۲ رمارچ ۱۹۳۷ء

علامہ اقبال "ضربِ کلیم" کے اسلوب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"باقی رہی کتاب سو یہ ایک (TOPICAL) چیز ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ایک اعلانِ جنگ ہے، زمانۂ حاضر کے نام اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے کہ میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ"۔ نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے۔ اس کتاب کو (REALISTIC) ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی (EPIGRAMMATIC STYLE) سے کی گئی ہے۔" [۱]

بات واضح ہوئی۔ علامہ اقبال نے بہت سے مسائل پر ایپی گرامیٹک اسٹائل میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر اس اسٹائل کو "ضربِ کلیم" میں برتنے کا ذکر کیا ہے اور میں اسے علامہ اقبال کے فطری ظریفانہ وجود سے وابستہ کرتا ہوں اور اس کا نمونہ اُن کے مشقِ سخن کے زمانے سے بھی پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بے شک باضابطہ اعلانِ جنگ ۱۹۳۶ء میں کی لیکن بغیر اعلانِ جنگ وہ تو ابتدائے مشق سے ہی اس جنگ کی تیاری کر رہے تھے، سن و سال کی بلوغت، فکر و نظر کی بالیدگی اور زبان و ادب پر حاکمانہ اختیار کے بعد وہ رنگ آیا جسے علامہ نے "ایپی گرامیٹک اسٹائل قرار دیا ہے۔

علامہ اقبال نے اس اسلوب میں صرف وقتی و ہنگامی موضوعات پر طبع آزمائی نہیں کی ہے بلکہ دائمی موضوعات و مسائل پر بھی جودتِ فکر اور ذکاوتِ نظر کی تیزی و براقی کو آزمایا ہے نہایت عمدگی سے وِٹ (WIT) کا مظاہرہ کیا ہے۔ یوں بھی یونانی طرز کا ایپی گرام عربی کے فنِ سجع گوئی سے ملتی جلتی صنف ہے، اور اس میں شعور مزاح کی چنگاری کے بغیر جان نہیں پڑتی۔ لاطینی شعراء

---

[۱] اقبال نامہ ص ۸- ۳۸۰ خط بنام سر سید راس مسعود مورخہ ۱۰ر اگست ۱۹۳۶ء

نے ایپی گرام کی صنف کو سیح سے قدرے وسعت دی اور اس میں جودتِ طبع کی چمک اور بذلہ سنجی کا شوخ رنگ شامل کیا اور پھر چارلس دوم کے عہد میں انگریزی شعراء نے اسے بے انتہا وسعت دی، ملٹن (MILTON) ڈرائیڈن (DRYDEN) ایسے شعراء نے اس میں ایسی طنزیہ اور ہجویہ جہت پیدا کی، جس سے یونانی واقف نہ تھے [1] علامہ اقبال کے پیشِ نظر انگریز شعراء کے ایپی گرام ہوں گے اور بلاشبہ "ایپی گرامیٹک اسٹائل" سے ان کا مقصود کٹیلا طنزیہ اسلوبِ تنقید کے ماسوا کچھ نہیں۔ روچیسٹر کا مشہور ایپی گرام ملاحظہ فرمائیے۔ تاکہ اس اسلوب کی فنی خوبی کا قدرے اندازہ ہو سکے، کتنے مزے کا روچیسٹر (ROCHESTER) نے شاہ برطانیہ چارلس دوم پر ایپی گرام لکھا جو ایپی ٹیف (EPITAPH) بھی ہے ۔

HERE LIES OUR SOVEREIGN LORD - THE KING.

WHOES WORD NO MAN RELIES ON,

WHO NEVER SAID A FOOLISH THING

AND NEVER DID A WISE ONE.

انگریزی زبان کے ایپی گرام لکھنے والوں میں رومانی دور کے شعراء نے بھی دل خواہ حصہ لیا ہے اور وِٹ (WIT) اور طنز (SATIRE) بلکہ مذاق (JEST) کے اچھے اور برے ہر قسم کے نمونوں کا انبار لگا دیا۔ جب شیلی کی عظیم تر تخلیق (PROMETHUS UNBOUND) شائع ہوئی تو اس کا نہایت بے رحمی سے تھیوڈر ہوک (THEODORE HOOK) نے یوں مذاق اڑایا:

SHELLY STYLES HIS NEW POEM 'PROMETHUS UNBOUND',

---

[1] دیکھئے میرے مضامین (EPIGRAMS -- A GREAT WEAPON) مطبوعہ "پاکستان ٹائمز"

(EPITAPH -- A GREAT WEAPON. مطبوعہ "پاکستان ٹائمز"

AND 'TIS LIKELY TO REMAIN SO WHILE TIME CIRCLES ROUND

(FOR SURELY AN AGE WOULD BE SPENT IN THE FINDING,

A READER SO WEEK AS TO PAY FOR BINDING.

علامہ اقبال نے بلاشبہ اِن ہی معنوں میں اپنی گرامیٹک اسٹائل کو ضربِ کلیم میں اپنانے کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اس کے نمونے "بانگ درا" میں بھی موجود ہیں، جو ان کے ابتدائی اَدوار کے کلام پر مشتمل ہے۔

خلاصۂ تحریر یہ ہے کہ علامہ اقبال کے اسلوب کا ثمال ظرافت ہے جو اُن کی ہمہ گیر فکر کے چقماق سے مَس ہو کر بے پناہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی عظمت کا ستون اسی اسلوب پر استوار ہے۔ اگر یہ تیکھا لب و لہجہ، یہ کٹیلے فقرے، یہ وقعیت، یہ چبھتا طنز علامہ اقبال کی شاعرانہ یافت سے الگ کر لی جائے، تو پھر اُن کے کلام میں خشک فلسفیانہ مباحث اور بیزار کن پند و نصائح کے سوا کیا بچ رہے گا؟ اثر انگیزی اور نفوذ پذیری کی قوت اسی نورس و تازہ کار اسلوب کی مرہون منت ہے۔ وہ کیفیت جو داغ کے یہاں چلبلے شعر اور چٹپٹی غزلوں میں تھی، اسے اقبال نے بڑے سلیقے سے علویت و رفعت سے ہمکنار کر دیا اور بزمِ محبوب کی شوخی کو وسعت دے کر دنیا و ما ورائے دنیا تک پھیلا دیا۔ اور عہد حافر کے رنگا رنگ سومنات پر حملہ آور ہوا۔ یونہی تو نہیں ایک بجلی سی نہاں خیال میں ہے۔

ضمیمے

۱ . میر کی داسوخت اور اقبال کا شکوہ

۲ . اقبال کی ایک نادر تحریر

۳ . دو مصاحبے

(الف) پروفیسر احمد علی

(ب) ڈاکٹر جمیل جالبی

۴ . ایپی گرامیٹک اسٹائل اوف اقبال

میر کی واسوخت اور اقبال کا شکوہ

واسوخت کی تعریف "تاریخ ادب اردو" میں یوں درج ہے کہ "واسوخت نظم کی وہ قسم ہے۔ جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم وستم، رقیب کے ساتھ بے جا محبت، اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے"۔ گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اس کا طرز تغافل اور ستم شعاریاں اسی طرح باقی رہیں تو پھر اس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گا اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

اس صورت میں ہم شکوہ کو واسوخت ہی قرار دے سکتے ہیں، ہر چند کہ اقبال کا مخاطب محبوب حقیقی ہے اور ان کی شکوہ سنجی حدود و قیود سے بہت ہی کم آگے بڑھتی ہے، لیکن نظم بناؤ سنگھار کے اعتبار سے واسوخت سے قریب ہے اسلوب اور لب و لہجہ بھی واسوخت نما ہے۔ جوش و خروش اور غیظ و غضب کا نقطۂ عروج یہ محسوس ہونے ہی نہیں دیتا کہ اقبال کا مخاطب کون ہے۔ من و تو کا حجاب اٹھ چکا ہے۔ وہ محبوبِ حقیقی کے حضور میں یوں بڑھ کر بات کرتے ہیں جیسے میر تقی میر اپنے گوشت پوست کے محبوب سے برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔

میر صاحب اردو واسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں۔ یہ صنف بھی دوسری اصنافِ شاعری کی طرح فارسی سے اُردو میں آئی ہے۔ اُردو میں میر، میر امانت علی اور جرأت کی واسوختیں خاصے کی چیز سمجھی جاتی ہیں۔ کچھ غزل نما واسوختیں میر سوز اور قائم چاند پوری کے یہاں ملتی ہیں میر کی واسوختیں

بڑے پائے کی چیز ہیں اور ان کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل کے پھپھولے پھوٹ کر بہہ نکلے ہیں۔
نیز میر تقی میرؔ بحیثیت نظم گو بھی اسی قدر عظیم شاعر ہیں جس پائے کا انھیں غزل گو مانا جاتا ہے۔

ہمارے نقادوں کی نگاہیں میرؔ کی غزلوں کے جلووں میں اس قدر الجھی رہی ہیں کہ میرؔ صاحب کی نظموں کی طرف کما حقہٗ نہ اٹھ سکیں۔ چنانچہ ان کی نظموں کی حقیقی قدر و منزلت کا جائزہ اب تک نہیں لیا جا سکا ہے، تھوڑے بہت جو اشارات ان کے قصائد اور مثنویوں کے متعلق ملتے ہیں۔ وہ تنقیدی سے زیادہ تشریحی ہیں۔ کلیات میرؔ میں ترکیب بند، نعت و منقبت، مدحیات و ستائشہائے گوناگوں، ہجویات، واسوخت، مثنویات، شکار نامہ، مثنویات جذبات عشق کے عنوانات کے تحت جو نظمیں درج ہیں۔ ان کا حجم غزلوں کے لگ بھگ ہے۔ مواد و اسلوب کے لحاظ سے خاصے کی چیزیں ہیں اور ان کے مطالعے اور چھان پھٹک سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح میرؔ کی غزلیں قدیم و جدید شعراء کی ذہنی تربیت کرتی رہی ہیں اسی طرح میرؔ کی نظمیں بھی رسم و رہ منزل کی جانب اشارہ کرتی رہی ہیں اور قدیم و جدید شعراء میرؔ صاحب کی غزل و نظم سے یکساں استفادہ کرتے رہے ہیں۔

میرؔ صاحب کی نظموں سے استفادہ کرنے والوں میں علامہ اقبال کا نام بھی آتا ہے۔ یہ دعویٰ ممکن ہے بادی النظر میں مضحکہ خیز نظر آئے، لیکن شواہد اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے میرؔ صاحب سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً واسوخت میرؔ اور شکوۂ اقبال میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے در و بست کے ساتھ ہی خیال کی مناسبت تقابلی مطالعہ کرنے والوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ شکوہ اور جواب شکوہ لکھتے وقت علامہ اقبال کے پیش نظر میرؔ کی واسوختیں رہی ہوں گی۔
واسوخت اور شکوہ فنی اعتبار سے ایک ہی صنف ہے میرؔ صاحب نے خود بھی ایک جگہ واسوخت کو شکوے سے تعبیر کیا ہے۔ میرؔ نے چار واسوختیں لکھی ہیں جو ۲۰ بندوں پر مشتمل ہیں۔ شکوہ اقبال اور جواب شکوہ میں ۶۷ بند ہیں۔ واسوخت اور شکوہ میں مخاطب کے اختلاف کے علاوہ فنی لحاظ سے دونوں کا تال سُر یکساں ہے۔ تمہید بتدریج ارتقاء اپنی وفاداری اور محبوب کی بے وفائی کا رونا، غیض و غضب کسی اور سے لو لگانے کی دھمکی اور آخر میں سپر انداختن۔

"شکوہ" میں اس التزام کو اقبال نے قائم رکھا لیکن چونکہ مجازی کے بجائے محبوب حقیقی یا ذاتِ باری تعالیٰ سے وہ مخاطب ہوئے ہیں اس لیے جا بجا احترام و تقدس اور القاب و آداب کو ملحوظ رکھا ہے آپے سے باہر کم ہوئے ہیں اور کسی دوسرے معبود کی پرستش کے اظہار سے اغماض کیا کہ مبادا کفر و الحاد سے دامن آلودہ ہو جائے لیکن ہیئت کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ کمالِ احتیاط کے باوجود دل کی بات زبان پر آتی ہی رہی اور فتوے لگ کر ہی رہے ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

پھر یہ آزردگیٔ غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

اے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

اقبال کے مذکورہ بالا اشعار کے تیور میں جارحانہ عشق کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ معشوق سے برہمی و بیزاری کا جذبہ شعلۂ مستعجل بن کر رقص کر رہا ہے۔ اقبال کے اس انداز تخاطب کے ساتھ

ہی تیر صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے :

روئے حرف اس کی طرف چشمِ حمایت اُدھر
ابرو اِدھر کو جھکے لطفِ عنایت اُدھر

پرسشِ حالِ کا بھی مجھ کو نہ ممنون رکھا
ہے یہ خاطر کہ حزیں دِل کے تئیں خوں رکھا

چوٹ مجھ کو بھی تو غیروں کی ملاقات کی ہے
چھوڑے یہ تو تو پھر آزردگی کس بات کی ہے

آشنا جتنے ہیں بیگانے نکل جاویں گے
سر جھکائے اسی کے اور چلے جاویں گے

مجازی و حقیقی اختلاف کے باوجود مذکورہ بالا اشعار میں میر و اقبال کی لَے مل جاتی ہے، معنوی اعتبار سے وہ ایک دوسرے کے ضمیمہ نظر آتے ہیں۔ مناسبت اور یکسانیت مضامین کی بہترین مثال میر و اقبال کے تمہیدی بند ہیں۔ میر کی واسوخت کے ابتدائی بند ملاحظہ کیجیے ؎

طرز اے رشکِ چمن اب تری کچھ تازی ہے
ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے
داغ رکھنے کو مرے ان ہی سے گٹھ بازی ہے
ہمدمی ان سے انھیں سے ہم آوازی ہے
گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ
رُکتے رُکتے روشِ غنچہ ہوا ہوں دل تنگ

ایک مدت ہوئی بدنامی و رسوائی ہے
بے کسی، بے دلی، درویشی و تنہائی ہے
صبح جب دی ہے دُعا گالی تری کھائی ہے
ابتدا سے مری ذلّت تجھے خوش آئی ہے
خلق کیا کیا تری بے طور یوں سے کہتی نہیں
میں بھی ناچار ہوں اب منہ میں زباں رہتی نہیں

علامہ اقبال شکوے کی تمہید اس طرح باندھتے ہیں ؎

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصّۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے

معنوی اعتبار سے اقبال، میر صاحب سے جدا ہوتے ہوئے بھی لب و لہجہ کے سحر میں مسخر نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے در و بست کا ہنر جو میر کو آتا ہے اقبال اس سے کما حقہٗ استفادہ

کرتے ہیں۔ کیا مذکورہ بالا بندوں کے مندرجہ ذیل مصرعے ایک ہی خیال کا ابلاغ نہیں کرتے؟ کیا اقبال، میر کی پیروی کرتے نظر نہیں آتے!

میں بھی ناچار ہوں اب منھ میں زباں رہتی نہیں — میر

قصّۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم — اقبال

گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ — میر

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے — اقبال

ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے — میر

جرأت آموز میری تابِ سخن ہے مجھ کو — اقبال

میر صاحب محبوب مجازی کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں اور ناز فرماتے ہوئے اسی پر یہ جتاتے ہیں کہ یہ ان کے ذوقِ پرستش کا ہی کرشمہ ہے جس نے محبوب کی تخلیق کی ہے، اس میں ادا و ناز پیدا کیا ہے۔ اس سے پہلے محبوبیت کے مفاہیم سے دنیا آشنا نہیں تھی اور نہ تیرے وجود میں کشش اور بانکپن کا ہی کسی نے اندازہ لگایا تھا۔ ہر چند کہ تیرا وجود تھا لیکن ابھی تک دنیا تیرے حسن پر شیدا ہونے کے طور طریقے سے ناواقف تھی۔ لہٰذا یہ میرا عظیم کارنامہ ہے کہ تجھے ہم نے اس قدر پوجا کہ قابلِ عبادت بنا دیا۔ یہ تقدیس، یہ بزرگی، یہ عظمت دراصل میرے دم سے ہے، اور جملہ زیبائی اور جلوے کا خالق میں ہوں۔ مجھ سے پہلے کچھ نہ تھا اور نہ میرے بعد ہی کچھ ہوگا،

ملاحظہ کیجیے ؎

بیشتر ہم سے کوئی تیرا طلب گار نہ تھا
ایک بھی نرگسِ بیمار کا بیمار نہ تھا
جنس اچھی تھی تری لیک خریدار نہ تھا
ہم سوا کوئی ترا رونقِ بازار نہ تھا
کتنے سودائی جو تھے دل نہ لگا سکتے تھے
آنکھیں یوں موند کے وے جی نہ جلا سکتے تھے

علامہ اقبال اس اچھوتے موضوع کو انتہائی حسین پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ اس بند میں مضامین کی مناسبت کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا میر سے مستعار لی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تصورِ محبوب مابعد الطبیعاتی ہونے کی وجہ سے تاثر اور ذہنی تلازمے بدل جاتے ہیں ۔

ملاحظہ فرمایئے ؎

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں معبود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

اور اس کے ساتھ کا یہ بند بھی ملاحظہ کیجیے اور میر کے مندرجہ بالا بند کے ساتھ پڑھیے میر کے آواز کی بازگشت صاف سنائی دے گی ؎

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی
اور تیرے لیے زحمتِ کشِ پیکار ہوئی

کس کی شمشیر جہانگیر و جہاندار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے

اب دفترِ شکایت کی یکسانیت ملاحظہ کیجیے۔ میر صاحب کو اپنی حرماں نصیبی و نارسائی کا اس قدر رنج نہیں جس قدر محبوب کی بیوفائی اور اغیار آشنائی پر ہے لہٰذا میر صاحب سرگوشیانہ لہجے میں کہتے ہیں لیکن انداز میں تیکھا پن اور شکوہ آمیز طنز ہے ؎

تم کو بھی آٹھوں پہر حرف و حکایت ان سے
بازو جانو ہوا نہیں چشم حمایت ان سے
شکر ان کا ہے جو ہے بھی شکایت ان سے
ہر طرح کوئی چلی جا ہے رعایت ان سے
ہاتھ کاندھے پہ کبھو رکھ کے کھڑے ہوتے ہیں
کبھی منت کرو ہو ٹک جو کڑے ہوتے ہیں
پاس ان کا ہے تمھیں خاطر انھیں کی منظور
ان سے ملنے میں نہیں کرتے کسی طور قصور
ان سے ایک دن میں کئی بار ملاقات ضرور
ان سے لگ بیٹھتے ہو بھاگتے ہو ہم سے دور
جن کا شیوہ ہے ستمزدگی انہیں سے صحبت
بندگی کیشوں سے پرخاش خدا کی قدرت

علامہ اقبال اپنی وفاکیشی اور محبوب حقیقی کی بے توجہی کا گلہ ادب و احترام سے کرتے ہیں لیکن مضامین شکایت اور انداز بیان میر صاحب سے مختلف نہیں ہے۔ نیز اقبال کا شکوہ

چونکہ قومی اور اجتماعی واسوخت ہے۔ اس لئے میرؔ جیسی تعمیم نہیں ہے ؎

اُمتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر
یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حُور و قصور
اور بے چارے مسلمانوں کو فقط وعدۂ حُور
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

اور ؎

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ واسوخت اور شکوہ کی ہیئت میں فرق نہیں ہے اور چونکہ ہیئت، طرزِ ادا اور اسلوبِ ابلاغ کو بھی متعین کرتی ہے۔ اس لیے عام طور پر تمام شعراء کی واسوخت یکساں نظر آتی ہیں اور اگر وحدتِ خیال اور جذبات سوختہ کو دیکھا جائے تو درحقیقت ہر دل کی دہکتی ہوئی آگ کا رنگ یکساں ہوتا ہے، لہٰذا میرؔ اور اقبال کے کلام کی مناسبت حیرت انگیز نہیں۔ دونوں بڑے شاعر ہیں اور ان کی واسوخت یا شکوے میں جارحانہ عشق نقطۂ عروج

پر نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس مخصوص صنفِ سخن کے علاوہ یہ دونوں شاعر اپنی عشقیہ شاعری میں مرنجاں مرنج نظر آتے ہیں اور تسلیم و رضا، بندگی و اطاعت اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بہرکیف اس حقیقت کا اعتراف بھی کر لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں کہ علامہ اقبال نے میر صاحب کی واسوخت سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور شکوۂ اقبال اور جواب شکوہ میں آوازِ میر کی بازگشت ملتی ہے۔

امروز ۱۹۵۷ء

نگارِ پاکستان، جون، جولائی ۱۹۶۸ء

اقبال کی ایک نادر تحریر

علامہ اقبال کی مستقل تصانیف کے علاوہ چھوٹے بڑے نثری مضامین، خطوط اور کلام پر مشتمل متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تمام چیزیں محفوظ کی جا چکی ہیں۔ ہنوز بے شمار ایسے جواہر پارے اخبارات، رسائل اور جرائد میں بکھرے پڑے ہیں جن سے علامہ موصوف کی شخصیت، سوانح اور فن سے متعلق کوئی نہ کوئی نیا پہلو نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد غیر مدوّن کلام کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہوئے، جن میں یقیناً اوّلیت کا سہرا "رختِ سفر" کے سر ہے:

۱۔ "رختِ سفر"	مؤلفہ :	محمد انور حارث	مطبوعہ یکم جنوری ۱۹۵۲ء
۲۔ "باقیاتِ اقبال"	مؤلفہ :	سیّد عبدالواحد معینی	بار اول مطبوعہ ۱۹۵۲ء
ایضاً	مؤلفہ :	سیّد عبدالواحد معینی بہ ترمیم و اضافہ محمد عبداللہ قریشی	بار دوم مطبوعہ ۱۹۶۶ء
۳۔ "سرودِ رفتہ"		مولانا غلام رسول مہر ترتیب و تحشیہ صادق علی دلاوری	مطبوعہ ۱۹۵۹ء
۴۔ "روزگارِ فقیر" (حصہ دوم)		فقیر سیّد وحیدالدین	مطبوعہ ۱۹۶۴ء

ان مجموعوں میں سے کسی میں بھی علامہ اقبال کی مشہور نظم "گورستانِ شاہی" پر لکھا ہوا اُن کا اپنا نوٹ شامل نہیں۔ البتہ "سرودِ رفتہ" (مطبوعہ ۱۹۵۹ء) اور "باقیاتِ اقبال" (اشاعتِ دوم ۱۹۶۶ء) میں "گورستانِ شاہی" کے بعض اشعار میں ردّ و بدل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

محمد انور حادث نے جو اِن دنوں "رختِ سفر" کا نیا ایڈیشن مرتب کر رہے ہیں، علامہ اقبال کی نظم "گورستانِ شاہی" پر لکھی ہوئی نہ صرف وہ نایاب و نادر تحریر ڈھونڈ نکالی ہے جو نظم کی پہلی اشاعت کے موقع پر "مخزن" جون ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی، بلکہ علامہ اقبال کی نظم "گورستانِ شاہی" مطبوعہ مخزن جون ۱۹۱۰ء اور مطبوعہ بانگ درا کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے، جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال" دونوں سے زیادہ جامع اور مکمل ہے۔

علامہ اقبال کی وہ فراموش کردہ تحریر یہ ہے:

نایاب تحریر

حیدر آباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد محکمۂ فینانس جن کی قابلِ قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولتِ آصفیہ مستفید ہو رہی ہے مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے۔ جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں چھن کے آئی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفرِ حیدر آباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لائق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں، جنہوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیامِ حیدر آباد کو دلچسپ تر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اقبال

مطبوعہ مخزن ——— جون ۱۹۱۰ء

"گورستان شاہی" کے شانِ نزول سے متعلق اس نایاب تحریر سے مؤلفین باقیات اقبال نے بھی استفادہ کیا ہے۔ لیکن نظم کا پس منظر لکھتے ہوئے علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل خط کشیدہ عبارتوں کو اپنا لیا ہے:

> یہ نظم "ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی" جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت ماحول کے ساتھ مل کر اقبال کے دل پر ناقابلِ فراموش اثر کیا۔

تحقیق و دیانت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ علامہ اقبال کی اپنی تحریر بجنسہٖ پیش کر دی جاتی پھر طور مؤلف "رختِ سفر" محمد انور حارث نے اپنی کتاب کے نئے ایڈیشن کے لیئے نہ صرف اس تحریر کو محفوظ کر لیا، بلکہ اس نظم کے تمام اشعار میں رد و بدل اور ترمیم و اضافہ کی نشان دہی بھی کی ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دنیا کے ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال بھی اپنے کلام پر بار بار نظرِ ثانی کرنے کے عادی تھے:

ملاحظہ ہوں ؎

مخزن: آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
یعنی دھندلا سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

بانگِ درا: مصرعہ ثانی میں تبدیلی:

کچھ مکدّر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

مخزن: فطرتِ نظارہ کا امکاں سراپا درد ہے
اور خاموشیِ لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

بانگِ درا: مصرعہ اول:

باطنِ ہر ذرّۂ عالم سراپا درد ہے

مخزن : گرچہ باغ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

بانگ درا: مصرع اول:

رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں

مخزن : کہہ رہی ہے کوئی ایام کہن کی داستاں
چاندنی کرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں
شورشِ بزم طرب، کیا عود کی تقریر کیا
قیدیٔ زندانِ غم کا نالۂ شب گیر کیا

بانگِ درا: پہلا شعر حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں تبدیلی کی گئی ہے:

درمندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا!

مخزن: یہ قمر جو ناظمِ عالم کا اک اعجاز ہے
پہنے سونے کی قبا، محوِ خرامِ ناز ہے

بانگِ درا: چاند جو صورت گرِ ہستی کا اک اعجاز ہے
پہنے سیمابی قبا محوِ خرامِ ناز ہے

مخزن: صبح کے تارے پہ تھی مشرق کے رہزن کی نظر
وہ اُڑا کرلے گیا آویزۂ گوشِ سحر
شب کے اختر دیدۂ خورشید سے ڈرتے ہیں یہ
بھیس شبنم کا بدل کر سیرِ گل کرتے ہیں یہ
رات یہ تاروں بھری ذوقِ نظر کی عید ہے
ریزہ ریزہ ٹوٹ کر پیمانۂ خورشید ہے

اُگتے ہیں شاخِ چمن سے شعلۂ بے سوزِ گل
روح کا فردوس ہے حسنِ نظر افروزِ گل
زندگی کی مے سے مینائے جہاں لبریز ہے
منظرِ حسرت بھی ہے کوئی تو حسن آمیز ہے

بانگ درا: شروع کے چار اشعار حذف ہیں:

زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے
موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے

مخزن: خندۂ طفلک سے ہے اس کی چمک محبوب تر
چھو نہیں سکتی اسے صرصر کی موجِ پُرخطر

بانگِ درا: موجود نہیں۔

"گورستان شاہی" کے شانِ نزول کے بارے میں علامہ اقبال کی صراحت نکار ممکن نہیں یہ نظم اپنی اثر آفرینی اور گہرائی و گیرائی کے باعث ان کی ایک اثر انگیز نظم ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے بعض۔ ناقدین اسے ان کی طبع زاد نظم تسلیم نہیں کرتے بلکہ سون برن کی ایک نظم THE GARDEN OF PROSERPINE کا فیضان قرار دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے ذہن میں سون برن کی نظم کا تاثر محفوظ رہ گیا ہو اور سلاطین قطب شاہیہ کے گورستان کی سیر کرتے ہوئے اس نظم کے تاثر نے تحت الشعور میں تازہ ہو کر خاص ہیئت اختیار کر لی ہو۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہ نظم لکھتے ہوئے علامہ اقبال نے شعوری طور پر سون برن کی نظم سے نہ استفادہ کیا ہے اور نہ یہ نظم "گورستانِ شاہی" لکھتے وقت ان کے پیشِ نظر تھی۔

(افکار۔ خاص نمبر ۱۹۶۹ء)

دو مصاحبے

پروفیسر احمد علی

پروفیسر احمد علی ہمارے ملک کے معدودے چند ایسے ادبا میں ہیں جن کو اپنے منصب کی فضیلت کا بے انتہا احساس رہا ہے اور اپنے بھرم کو انھوں نے قائم رکھا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور جب ہم ان کے مطالعے کے "تہہ خانے" میں آئے اور حاشیہ کی باتیں حرفِ مدعا پر ختم ہوئیں تو وہ جھوم کر اُٹھے اور اقبال پر اپنی تصنیف شلف سے اٹھا کر دی، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا محض ایک نسخہ شائع ہوا ہے تاکہ کاپی رائٹ کرانا ممکن ہو۔

میں کتاب پڑھنے میں محو ہو گیا اور وہ اپنے کلام میں مصروف ہو گئے، مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک نئے اقبال سے مل رہا ہوں اور جب کتاب ختم ہوئی تو میں نے اُن سے سوال کیا: "اقبال کی فکری یافت کے متعلق آپ کی پوری کتاب پیشِ نظر ہے۔ آپ کی نظر میں فکر سے قطع نظر وہ کس پائے کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ؟

اُنھوں نے کہا " اقبال کی شاعری کے چار پہلو ہیں۔ پہلا وہ، جب اقبال اس صدی کے اوائل میں شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب مولانا حالی کا اختراع کردہ "نیچرل شاعری" کا نظریہ بقول شخصے "غلط الخاص فصیح العام" ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو شاعری اور اس کی روایات کے خلاف محمد حسین آزاد اور حالی کا پھیلایا ہوا انتشار نئی نسل کے لیے جدید اور

مغربی ہونے کے سبب افضل ہونے کی سند حاصل کر چکا تھا۔ اس خیال اور "نئے" طرز تحریر سے متاثر ہو کر اور خود بھی ولایتی تعلیم حاصل کرنے کے سبب اقبال نے آزاد اور اسمعیل میرٹھی کی نظم کا طرز اختیار کیا اور "ہمالہ" ۔۔۔ اور "ایک پرندے کی فریاد" جیسی نظموں نے شہرت حاصل کی۔

"فلسفہ کے طالب علم ہونے کے علاوہ اقبال میں فکری جستجو کا مادہ خود بھی موجود تھا۔ اس وقت کی بعض نظموں میں بھی تخیل کی جولانی کے دوش بدوش جھلکتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں اقبال 'فکری گہرائی' کا پتا بھی دیتا ہے اور نظریاتی بھی نہیں کہلا سکتا۔ اس وقت کی نظمیں تخیل اور تمثال کی افراط کی وجہ سے ان کے شاعر ہونے کا پتا دیتی ہے۔ ان کا یہ دور امنگ اور قوی بیداری کے ساتھ ساتھ شاعری کا دور تھا جس میں نہ امتیاز کافر و مومن ہی پرواز تخیل میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا، نہ فرق گبر و مسلمان ہی تمثال کو دھندلاتا تھا، جو بعد میں ان کے شاعرانہ مزاج اور جذبۂ حب الوطنی کو ایک حد تک محدود کر دیتے ہیں اور آخر میں "ہم قوم" کے تصور کو "ہم مذہب" میں بدل دیتے ہیں۔

اُن کی شاعری کا دوسرا پہلو وہ ہے، جس میں اقبال ہندوستان والوں کی زبوں حالی کو چھوڑ کر ہندوستانی مسلمانوں کی حالتِ زار کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دیتے ہیں۔ اور یہاں بھی مولانا حالی کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ کیونکہ اب "مسدس" کے سہارے وہ مسلمانوں کی ابتری کا "شکوہ" اللہ سے کرتے ہیں اور خود ہی ان کی طرف سے "جوابِ شکوہ" میں صفائی کا دروازہ کھولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع تخیل کی پرواز کا نہیں، بلکہ غور و فکر کی گہرائی اور احساس کمتری کے بوجھ سے دب جاتی ہے اور اکثر سخن سنجوں کو اقبال کا وہ دور یاد دلائی ہے، جب ان کی شاعری کا حلقہ ہندوستان اور پورے جہان پھیلا ہوا تھا۔ جس میں وطن کا درد اور حب الوطنی کا جذبہ "پرندے کی فریاد" میں آزادی کے لیے بیقراری اور ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

کے دل سوز نغمے میں سنائی دیتا ہے۔

یہ آواز، اب آوازِ بازگشت ہو کر رہ جاتی ہے اور نغمہ وہی رہتا ہے، الفاظ بدل جانے سے ایک اور ہی صدا کانوں میں آنے لگتی ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

یہ بات نہیں کہ یہ جذبہ بذاتِ خود اعلیٰ و مستحسن نہیں مگر شاعر کے مسلک کو حلقہ بگیر کر دیتا ہے۔ گویا چوڑی سڑک پر چلتے چلتے پتلا راستہ بن جاتا ہے دنیا اور جہاں سمٹ کر مسلمانی حدود میں گھر جاتے ہیں اور فکر کی وسعت نفسیاتی طور پر احساس کمتری کی نذر ہو جاتی ہے اور شاعری تخیل کی بلند پروازی اور آزادیٔ تمثال سے عاری معلوم ہونے لگتی ہے۔ خیال کی ہمہ گیری طبقاتی مفکر کا پیغام کسی ایک طبقہ کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے لیے ہوتا ہے، اس لیے شاعر کہتا ہے ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔

چنانچہ اقبال مسدس حالی کی طرح مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا سبب و علل میں نہیں بلکہ مذہب سے دُوری اور عقیدہ کی کمزوری میں تلاش کرتے ہیں' اس خیال کی وضاحت میرے اس مضمون میں موجود ہے اور مسلمانوں کے زوال کے وجوہ اس مضموں میں شامل ہیں جو "ترقی پسند ادب کا پس منظر اور ن۔م۔ راشد" کے عنوان سے ماہنامہ "افکار" میں مارچ کے مہینے شائع ہو چکا ہے۔

اقبال کی شاعری میں فکر و فلسفہ تو نمایاں رہتا ہے لیکن اس کا رخ انسانیت سے ہٹ کر اسلام کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اسی دَور میں وہ اپنے اہم ترین کلام سہ نظم[1] (TRILOGY) کا منصوبہ تیار کرتے ہیں جو مسلمان ہند کے لیے اردو زبان میں نہیں بلکہ وسیع حلقۂ قارئین تلاش کرنے کی کوشش میں فارسی میں لکھا گیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اب فارسی مسلمانوں کی بین الاقوامی رابطے کی زبان نہ رہی تھی اور انگریزی رائج ہونے کے بعد ہندوستان میں بھی کم ہی سمجھی جاتی تھی۔ اسی "سہ نظم" کی پہلی نظم "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء اور تیسری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی اور سر محمد اقبال کی شخصیت کو علامہ اقبال کی سمت موڑ دیتی ہے۔ اب ان کا نظریۂ فکر و حیات کلیتاً اسلامی ہو جاتا ہے جس کے تحت لکھی جانے والی نظمیں "بالِ جبریل"۔ "پیامِ مشرق" اور "ارمغانِ حجاز" میں شامل ہیں۔ اب

---

[1] یہ علامہ اقبال کی تین مثنویاں "اسرارِ خودی"۔ "رموزِ بے خودی" اور "جاوید نامہ" ہیں

اُن کا مناظرِ حُسن سرتاپا اسلامی جامہ پہن لیتا ہے۔ اور شاعر کا پیغام صرف مسلمانوں کے بھی ایک ہی طبقے سے وابستہ رہ جاتا ہے، چونکہ ان کا اسلامی تصور تصوف سے ابا کرتا تھا، اس لیے حافظ اور ابن العربی کو بھی پسند نہ کرتا تھا، جس کے سبب "اسرارِ خودی" نے مسلمانوں کے بڑے طبقے کو تقویت کی جگہ اذیت پہنچائی تھی۔ اس کی اصلاح کے بعد بھی ان کی فکر تصوف کے تخیل آمیز اور ہمہ گیر جذبے سے عاری ہے۔ علامہ کی شاعری چوگانِ خواب میں چاہے بے خوف کیوں نہ ہو، چوگانِ تخیل میں بے نعل رہ جاتی ہے۔ ایک بلند پایہ صوفی اور شاعر کا مسلک بنی نوعِ انسان کے ہمہ گیر درد، کاوش اور تلاش و جستجو کا اظہار اور معمۂ زندگی کا حل دریافت کرنا ہے، جو شاعری ایک ہی سمت میں اشارہ کرتی ہو، پرواز تخیل سے وا ماندہ نظر آتی ہے اور تخیلِ پرواز سے لاچار۔ حافظ شیرازی کی شاعری بھی اسلامی ہے لیکن طبقاتی جذبے سے پاک ہونے کے سبب کل انسانیت کو تسکین بخشتی اور روحِ انسانی کو مالا مال کرنے والی ہے۔

اسی طرح دانتے اور ملٹن بھی مذہبی شاعر ہیں لیکن دانتے کی (DIVINE COMEDY) اور ملٹن کی (PARADISE LOST) کا تاثر صرف عیسائیوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کے لئے اپیل گراں ہے اور نہ وہ اہم سوال اور رمز و رموز اور روحانی کشمکش وا قدار بھی جن کے نقوش اِن نظموں میں ابھرتے ہیں، کسی ایک مذہب یا طبقہ تک محدود ہیں۔

میں نے متعجب ہو کر پوچھا "یہ کیوں کر ؟"

پروفیسر احمد علی نے مدھم لب و لہجہ میں کہا "شاعری احساس دل اور دردِ انسانی کے لطیف جذبے کے اظہار کا نام ہے جس میں تخیل حسن و گداز پیدا کرتا ہے۔ ایک نقطہ سے پھیل کر شاعری کائنات کی وسعتوں کو اپنے احساس میں سمیٹ لیتی ہے اور ایک نفس کی حرارت میں نفس انسان کا بنا دیتی ہے۔ اس کی پہنچ لا محدود ہے اور اس کا جذبہ ہمہ گیر۔ جب شاعری کسی پیغاماتی پیمانے میں محدود ہو جاتی ہے تو اس کے بیان کی وسعت اور پیغام کا اثر دونوں لامحدود ہو جاتے ہیں۔ ملٹن کی پراڈائز لوسٹ اور دانتے کی ڈیوائن کامیڈی ایک محدود جذبۂ تحریک سے شروع ضرور ہوتی ہیں، لیکن کشمکشِ حیات اور تجسس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں اور قلبِ انسان کو راحت و سکون بخشتی ہیں۔ ان کا پیغام کسی طبقے یا

جغرافیائی حدود اربعہ تک نہیں رہتا بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیے یکساں اور برابر ہوتا ہے۔ اب زیرِ غور موضوع کو پیشِ نظر لائیے، نہ یہ دنیا صرف مسلمانوں کے لیے تخلیق ہوئی ہے، نہ خدا کا تصور ہی مسلمانوں پر موقوف ہے۔ مسلمانوں کے پیغمبر نزولِ قرآن سے پہلے بھی موجود تھے اور اسلام سارے عالم کے لیے پیغام لے کر آیا تھا اسے حدودِ اربعہ میں نظر بند کرنا اس کے مقصد کو بھول جانا ہے۔ یہ درس ہم کو دانتے کے ہاں بھی ملتا ہے اور ملٹن کے ہاں بھی۔ اس کے برعکس سر محمد اقبال جو اب علامہ اقبال کا درجہ حاصل کر چکے تھے، ہمہ گیری سے تہی دامن اور خارجی حقیقت کو ایک کوزے میں بند کر کے محدود نظریہ اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی شاعری فکر کی رحل کو بھی تہہ کر کے سیاسی میدان کا رخ کرتی ہے اور ان کا وہ پیغام جو مسلمانوں کی جمعیت سے تھا :

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اب ایک جغرافیائی ہیولیٰ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ "جہاں" جو مسلمانوں کے لیے وقف تھا، اب مختصر سے حدودِ اربعہ سے وابستہ ہو جاتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی پرواہ نہیں کرتا اور وطن کا وہ تصور جو سارے جہاں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے تھا اب تار تار نظر آتا ہے۔

اپنے زمانے میں مسلمانوں نے اس نظریئے کے تحت اپنے اپنے جغرافیائی وطنوں کو خیرباد کہہ کر اسلام کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وائے ناکامی کہ اب وا ماندگیٔ شوق کے فروغ کے معنی وسعت سے سمٹ کر ایک خطۂ خاک رہ گیا اور وہ وقفہ ہائے تاریخ چند انگلیوں پر گنے جانے لگے اور جن کے اثاث کبھی دارا و کیقباد و کیخسرو سے جا ملی تھی، اب پورس اور داہر سے آگے نہیں بڑھتی۔ حدودِ تنزل و انحطاط کس قدر بردا زما اور تنگ و تاریک ہیں !

ایک زمانہ تھا، جب دنیا کے عالمگیر نظریئے اسلامی فکر کے محتاج تھے، چاہے وہ دانتے کی عظیم نظم کا محرک معجزۂ معراج ہو یا کارل مارکس کا سوشلزم جو مساواتِ اسلامی کا مرہونِ تخیل ہے، اور آج وہی مسلمان اپنے ہی سے لیے ہوئے خیالوں کے لیے دوسروں کے دست نگر ہیں اور بلخ و بخارا کو

بُھلا کر ماسکو اور واشنگٹن کے اشاروں پر کٹھ پتلی کا ناچ ناچ رہے ہیں۔ کبھی ارسطو اور افلاطون کو بھی نہ گردانتے تھے، آج وہ علامہ اقبال کے سوا کوئی اور چارہ گر اور رہنما پیش نہ کر سکے۔

علامہ اقبال کی شاعری کا چوتھا پہلو، چنانچہ دردِ مسلمانانِ خطۂ ہند اور اس کے خواب کی تکمیل میں مضمر ہے، جن کے سبب ان کا رتبہ اور بھی بلند ہو گیا ہے اور جس سے وہ آج نہ تو اقبال نہ ڈاکٹر اقبال نہ سر محمد اقبال بلکہ تقدس و احترام کا خرقہ اور جبہ پہنے علامہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

مطبوعہ "عوامی عدالت"

۱۸ر اپریل سنہ ۱۹۷۴ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

پروفیسر احمد علی کے یہاں سے اٹھ کر ڈاکٹر جمیل جالبی کو ٹٹولا تو وہ گویا صدیوں سے لب گزیدہ بیٹھے تھے۔ پہلے تو مسکراتے ہوئے پڑھا ؎

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اور میرے اصرار پر انکسار فرمانے لگے، پھر" آپ بضد ہیں تو لکھئے" اور میں لکھتا چلا گیا۔ چونکہ میرا سوال اقبال کے مابہ الامتیاز خصوصیت سے متعلق تھا۔ لہٰذا انھوں نے جواب کا سرا یہیں سے پکڑتے فرمایا:

اقبال کی خصوصیت (یہ الفاظ آپ نے استعمال کیا ہے، میں نے نہیں) یہ ہے کہ قومی شاعر، اسلامی شاعر کہلانے کے باوجود اور لاکھوں روپے" اقبالی اداروں" پر صرف ہونے کے باوصف آج تک اقبال اور اس کی شاعری پر کوئی کام نہ ہو سکا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اقبال پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن سوائے ایک آدھ کے بیشتر کتابیں کوڑا کرکٹ ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے ارد گرد تقدس اور پاکیزگی کا ایک ایسا جال بن دیا گیا ہے کہ اب ہم اقبال اور اقبال کے کلام سے بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ اب تو خدا کی شان یہ ہے کہ وضو کر کے ہمیں کلام اقبال کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ اقبال کے حوالے سے کلام اقبال کا ذہنی آزادی اور فکر و شعور کے ساتھ مطالعہ کریں تو بحمد اللہ ایسی تصنیف یا مضمون کو کوئی ادارہ شائع کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

صرف اندھی تقلید کے سہارے ہم نے اقبال جیسے عظیم شاعر کو کھو دیا ہے۔

خیر جہاں ہم نے بہت سی اچھی چیزیں اور قدریں کھو دی ہیں، وہاں حقیقی اقبال کی گمشدگی کو بھی سینے پر افسوس کا بھاری پتھر رکھ کر برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اقبال تو تشکیلِ جدید اور ملی نشأۃ الثانیہ کا آدمی تھا، وہ تو بڑا اپدیشک تھا، مگر کہاں گیا؟ کون تلاش کرے، کسے فرصت ہے؟ آپ بھی جانے دیجئے۔

"نہیں" میں نے عرض کیا" میں اسے جانے نہیں دینا چاہتا۔ ازراہِ کرم آپ ہماری رہنمائی فرمایئے۔ اور یہ بتایئے کہ اب اقبال کی بازیابی کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے؟"

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا "رہی بازیابی کی بات تو ظاہر ہے کہ پولس تھانے کی نوبت نہیں آئے گی البتہ فکر کے سرے کو جہاں اقبال نے چھوڑا تھا، وہاں سے اسے آگے بڑھانے کی ضرورت پڑے گی۔ اقبال کو رد و قبول کے ذہنی و فکری عمل کے لیے تقدس کے جال کو نوچنا پڑے گا۔ یہ کام خود اقبال نے اپنی فکر کو مرتب کرنے اور آگے بڑھانے کے سلسلے میں کیا تھا اور یہی کام اقبال کی بازیافت کے سلسلے میں ذہنی و فکری سطح پر (اخباری سطح پر نہیں) کرنا پڑے گا۔ اگر یہ عمل یہاں جلد شروع نہیں ہوگا تو یاد رکھئے کہ خود فکرِ اقبال کا وہ "تہہ داماں چراغ" بھی گل ہو جائے گا جسے ہم اب تک بچائے ہوئے ہیں۔ سوچ لیجئے، ویسے آپ کی مرضی۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں جو اُس نے کہا تھا ؎

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

مطبوعہ: عوامی عدالت ۱۸ اپریل ۱۹۷۴ء

EPIGRAMTIC STYLE OF IQBAL

By epigram the Greeks meant nothing more than a simple concise inscription, sometimes it was engraved on tombs and sometimes on statues. The hard material on which it was to find place compelled brevity of expression. In the course of time the epigram became a vhicle for wit and satire.

The use of epigram for the purpose of satire was only little known among the Greeks. Credit goes to the Romans, who added humorous intention to the Greek severity of form. Afterwards English poets found it the most appropriate form of showing their wit.

In the time of Charles II, epigrams flourished profusely. Great poets there were, like Milton and Dryden - the first with an andience fit, no doubt, but singularly few; the second only popular when he produced what he should never have written. Besides them there was an abundance of scholors and wits; some of whom were privileged to make the king himself the butt of their jest. Every body has heard of Rochester's famous lines:

> Here lies our sovereign lord the king, whose words no man relies on: Who never said a foolish thing and never did a wise one.

Here we have both epigram and epitaph Among the Greeks, with whom this art of concise and finished expression originated the epigrams and epitaphs,were generally on a par though not the same.

Pretty much of the satiric shot was one of the early criticisms of Coleridge's Ancient Mariner.

Your poems must eternal be,
"Dear Sir, it cannot fail;
For it's incomprehensible,
And without head or tail."

On the publication of the greatest of his poems the prometheus unbound, Shelley was even more unmercifully treated for Theodore Hook wrote:

Shelley styles his new poem 'Prome-
thus unbound'. And it's likely to
remain so while time circle round.
For surely an age would be spent in
the finding, A reader so week as to
pay for the binding.

The literary epigrammatists is unmerciful even to woman of many of them it has to be sorrowfully admitted that they are extremely ungallant to women. But if one poet is cruel to the gentle sex, another hastens to heal the wound with a tender compliment.

The epigram has been called the hornet of poetry, because it so often carries a sting in its tail. The epigram may be put to all sorts of uses. Some of the best epigrams ever written are quite innocent of satirical intention, and are in fact, the brief melodious expression of

beautiful thoughts. A fine example is the love epigram of Plato.

Thou eyest stars, my star?
Oh might I be
You host of stars, to be mine eyes
on thee.

Most of the persian and urdu quatrains (Rubayat and Qataat) possess the quality of the epigram. The honoured personalities and common dignitaries whom often the epigrammatist made the butt of their jest are: Sheikh, Zahid, Muhtasib, Faqih-e-Shahar, Pir-e-Mughan, Mulla, Waiz, Naseh, etc. Among prophets Hazrat Musa and Hazrat Khizr deserve some credit to provide wit to many a poet.

Urdu and Persian poets, though not pagan, on occasions have not been reverent to God. And Iqbal is not an exception. Seeing starving humanity he cried aloud:

Is no wine left in thy flask
(or) Are you not my God, bestower?

From thy ocean thirst beaten should be doled out only a drop.

This is surely an act of miserliness and not of generosity.

Iqbal in Armughan-i-Hijaz boasts:

Just think of the advantages and loss, Make this world eternal like paradise.

O God don't you see how . the earth-born people.

Have decorated this earth!

In Javid Namah Iqbal put some quiver questions:-

Who am I? What are you?
What is the world?
Why is there distance between you and us?
Why am I in the bondage of Fate?
You don't die, why do I?

In another place he hits the omnipotent god as he believe in immanent god and not in transcedental. He says:

O God, you know the test of eternal life, But, you don't know the test of death.

Iqbal's epigram on demecracy is quite sataric. He says:

Run away from democracy and be the slave of the perfect man.

For out of two hundred asses human wisdom cannot be derived.

Besides conventional targets Iqbal favourite pets are Plato, Marx, Hafiz, Avicenna Neitzsche and so many men of letters and philosophars.
Hafiz and Plato both are 'gosfend'(sheeps) in his eyes. He says about Neitzsche; just note the sting in the tail:

If song you crave, flee from him,
Thunder roars in reed of his pen.
He plunged a lancet into Europe's heart; His hand is red with the blood of the cross, He reared a pagoda on the ruins of temple
His heart is a true believer's

but his brain is an infidles

There are great out pouring of epigramatic style in Iqbal's Urdu and Persian Works on impearlism Iqbal hits:

> A human shape dwells in a museum with a legend upon its silent lips, telling the history of imperialism, and giving visions to the blind what is the grand design of Imperialism? To seek security to contriving divisions.

Iqbal's political insight was undoubtedly prophetical. He has made the 'League of Nations' the butt of his satire, in more than one of his short poems. Once it seemed merciful, but now, not without reason. He says in Pas Cheh Bayad Kard:

> Present day diplomacy named its imperialism as "League of Nations". It tightened its grip but declared it was loosing it, One cannot open wings in its surroundings, Nor door could be unlocked with its key.

Allama Iqbal has rendered the most heroic saying of Tipu in his own epigramatic style:

> Immortality is in the breadth of life - I donot ask of God for length of days, What is the law, the religion, the rite of life? Better one instant a loin, than a centuary of sheep.

Iqbal has a developed sense of humour and a satarist of extra ordinary ability from his childhood. He owes Dagh

and Akber, one his 'ustad' another his 'murshid', the colour and essence of his epigramatic style. Writing to Ross Masood he has confessed that he has exercised the epigramatic style in ZARB_E_KALEEM to fullfil the shortcoming of the dryness of the topical subject. But I feel, he was nothing more than a satirist, the wit of Dagh and humour of Akabar was in his blood.

Epigram is a great weapon and Iqbal has used it while wagging war against the moderan world, its thinking and concepts, political, and its social and religious institutions.